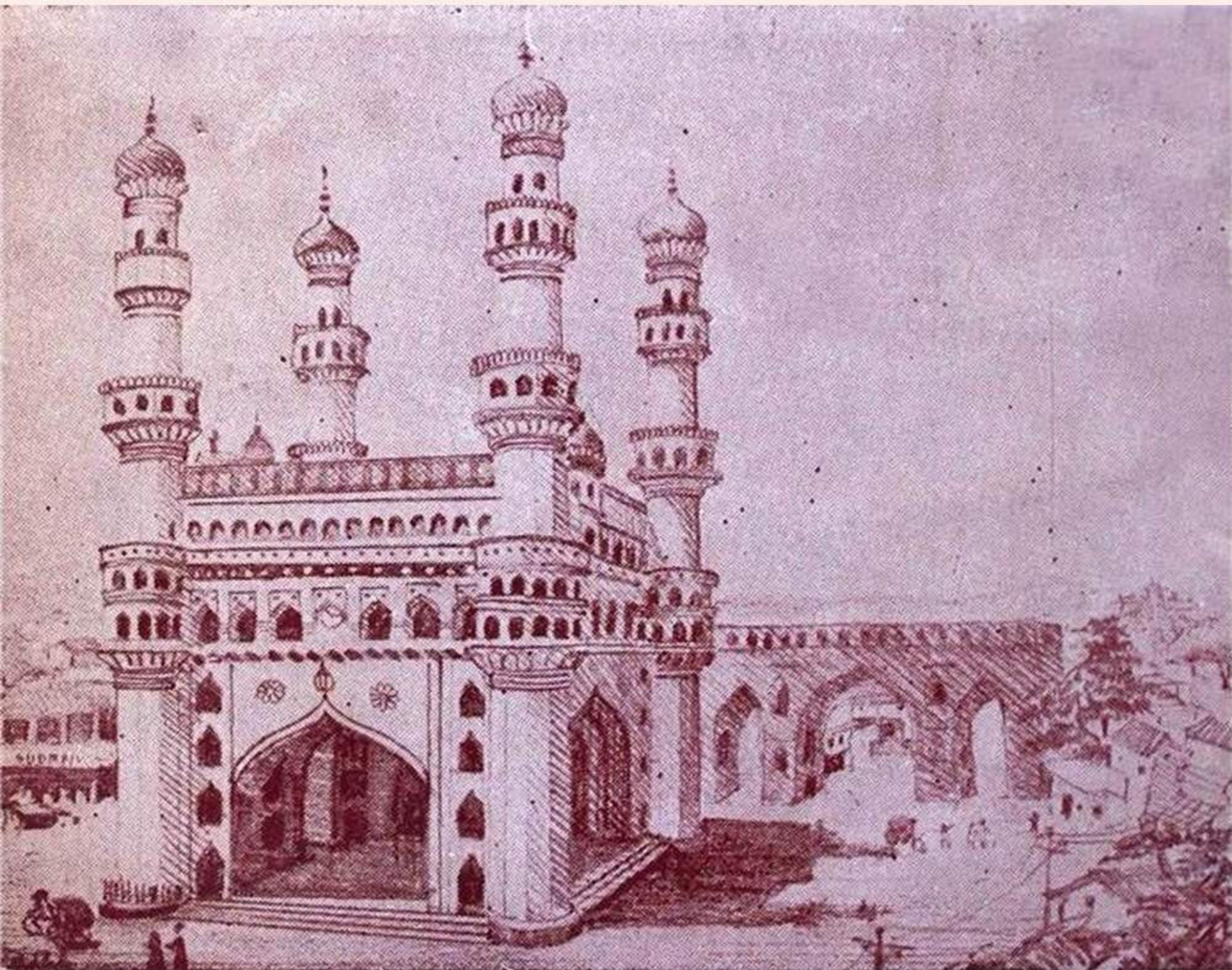


آباد حیدر آباد پر



ڈاکٹر حسینب انصاری

۳۰۰ آباد حیدر آباد رہتے

(مجموعہ مضمون)



ڈاکٹر طیب النصاری

جلد حضرت بحق مصنف محفوظ ہیں	
آباد حیدر آباد رہتے	نام کتاب :
ڈاکٹر طیب النصاری	نام مصنف :
تدریس، صدر شعبہ اردو، فارسی، عربی گورنمنٹ کالج گلبرگہ ۸۵۱.۷	پیشہ :
۵۰۰۲۸ - ۱۰ جہد کا پیغم - حیدر آباد ۱/۱۵	پستہ :
۱۹۸۸	سنداشتہ :
پارچ سو	قدیم داشتہ :
سید الوار احمد	کتابت :
پیکپ پرنٹر سر سندھ حیدر آباد ۵۰۰۰۲	طبع :
انخاب پرسیں، جواہر لال نہرو روڈ، حیدر آباد ۱۰۰۰۰۵	سردی :
۵۰۰۳۶ - حیدر آباد کیشنر، حیدر آباد ۱۰۰۰۵	ناشر :
ادبی شرست، حیدر آباد	بہ افاق :

- (ملئے کے پتے) :-

- * ادبی شرست بتوسط روزنامہ سیاست جواہر لال نہرو روڈ حیدر آباد ۱۰۰۰۵
- * الیاس شریڈس - شاہ علی بندہ روڈ، حیدر آباد ۱۰۰۰۵
- * حسائی بکڈپو پھر گئی حیدر آباد ۱۰۰۰۵
- * مکتبہ رفاه سام نزد دگاہ بندہ نواز گلبرگہ ۸۵۱.۳

قیمت: بیس روپیہ

اللہ و رسول حق کی امداد رہے
سر بزر یہ شہر فیض بُنیار رہے
لواب ایسا رئیسِ اعظم ایسے
یارب، آہاد، حیدر آہبار رہے

میر امیں

مُجتبی عُسَین،
کے
نام

”بے شک ہم اپنے ملک کے بڑے ادیب یاں - یوں بھی ہمارے
ملک میں کوئی پھرٹا ادیب پیدا ہی نہیں ہوتا!“

جاپان چلو، جاپان چلو مگر از مجتبی عسین

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ترتیب

پیش نظر

- | | |
|----|--|
| ۱۱ | کوچہ بہ کوچہ : آباد، حیدر آباد رہے |
| ۱۶ | حیدر آباد، دیدہ دشیندہ |
| ۲۵ | حیدر آباد، یہ جگہ ہے جنگ آزادی |
| ۲۹ | الزار اعلوم کالج، بیتے دلوں کی باتیں |
| ۳۷ | الند شریف، ایں در دکن ... |
| ۴۱ | غلبرگہ شریف، ہندلیانی تہذیب کا گھوارہ |
| ۴۸ | سیور، خواب لور خاپ زاروں کی بستی |



- | | |
|----|---|
| ۵۶ | نام بہ نام : قمیرہ النصاری، مقام اپنی خودی کا |
| ۶۳ | جلیل تنور، اکبے نام سی چاہت کا آجالا |
| ۶۸ | علم صہا لاپدی، روش ریکھائیں |

۶

- ۷۶ فضلِ سُبْرَجُویٰ ، آج ایک تشنہ آلام
 ۸۰ سپہان خلیب ، میں انمول ہیرا ہوں ...
 ۸۵ اسماءِ علیس ، وہ ایک مردِ قدر تھا
 ۸۹ ڈاکٹر دَدَر ، ان کے کام کرنے کا ...
 ۹۳ شخصِ الامراء ثانی ، عطر کا حکم دیا اور ...
 ۹۹ آصف سارع

○

- ۱۰۴ لفظ بِ لفظ : کتنی فرخندہ ہے شب
 ۱۰۸ بُوس
 ۱۱۲ جیسے بارِ صبا کا جھونکا مہ

○

- ۱۲۲ تدریقِ طروہ انزو ، بڑے بھائی

پیش لفظ

شاہ تھیر نے حیدر آباد کے لئے اپنا سماں سفر باندھا تب اپنے عزیز شاگرد سے کہا۔

”میاں ابراہیم! وہ بہشت ہے، بہشت! میں جانا ہوں، چلو تم بھی چلو؛“
مگر ذوق نے اسٹاکی ایک نہ مانی۔ حیدر آباد کے تکرداروں نے کہلا بھیجا تو جواب دیا۔

گرچہ ہے ملکِ دکن میں آج کل قدرِ سخنی
کون ہائے ذوق پر دی کی گلیاں چھوڑ کر

ذوق کے نئے ولی کی گلیاں“ اور اُراقِ مصود گے سے کوئی بڑھ کر بھیں بلکہ بہشت سے بھی!
ذوق کا یہ بند بہ قابلِ قدر ہے اور میں جانتا ہوں اپنے شہر کو چھوڑنا کتنا مشکل اور دشوار عمل ہے! ایمکے کی تکمیل کے ساتھ ہی جب میرے اساتذہ پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین، ڈاکٹر حسین ڈیپلی

اور ڈاکٹر زینت ساجدہ نے مجبور کیا کہ گلاب گو کالج میں اُردو کی جاییز ارخالی ہے اور تم فوری چلے جاؤ تو میں راضی نہ ہوا۔ مسعود صاحب نے کھمیلا اور زینت آپانے ڈرایا تب بھی نہ مانا۔
بھلا! ملازمت کی خاطر حیدر آباد کوں چھوڑ سکتا ہے؟ لیکن لگتا تھا میرے اساتذہ نے ٹھان لی تھی کہ وہ مجھے گلزار بھیج کر ہی دم لیں گے۔ دباؤ بڑھنے لگا۔ بالآخر ایک صبح اسی اجمن میں بوریٹ

ہوٹل پہنچا۔ بھی دن کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے۔ ابھی چاکے کا ایک چکلائیں بھی نہ پایا تھا کہ میرے درست محمود النصاری (ایڈیٹر روز نامہ منصف حیدر آباد) ہوٹل میں داخل ہوتے۔ میں نے کہا۔ ”اچھا ہوا تم آگئے۔ تم سے ایک ضروری مشورہ کرنا ہے!“ وہ میرے پیش ہیچھے گئے۔ میں نے سارا احوال سنایا۔ دمکھنے گے!

”دیکھ جو طیب! پہلی بات تو یہ ہے کہ گلبرگہ اپنا دمن ہے، دوسرا یہ کہ یہ حیدر آباد سے دور بھی تو نہیں لدھے۔ لوگ ملازمت کے لیے کہاں کہاں نہیں جاتے۔ تم یوں کہو جیدر آباد بھی میں ہو!“

میں مان گیا اور اسی سہ پھر گلبرگہ کے لئے نکل پڑا اور آج ۲۱ برسمون کے بیت جانے کے باوجود بھی بھیجا ہوں کہ میں حیدر آباد میں ہوں، جب میں گلبرگہ پہنچا اور پیاس کی ملاوٹ پر جو شہر ہوں تو تقریباً تین چار ماہ تک تھنائی میں آنسو بھاندار ہا ہوں اور کنج بھی اس جدائی سے میرا دل ردتا ہے۔ اصل میں یہ کسی عصیت کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ ایک لگاؤ ہے، ایک تعقیق فاطر، جس طرح اولاد کو اپنی ماں سے ہوتا ہے میہی وجہ ہے کہ مجھے ذوق پر خفہ نہیں آتا حالانکہ اس نے حیدر آباد جیسی بہشتِ ارضی کو مُحکم ادیانتا۔ دلی کو مچھوڑ کر تیر نے رد زندگی کاٹا ہے بخلاف اس کے ذوق نے سوہنگے اور افلانس کو گلے گانا پسند کیا مگر دلی سے اپنا ناطر نہ تورا۔

میرا محالہ یہاں قدر مختلف ہے۔ یہاں بھی میں میرا اور ذوق سے مختلف ہوں۔ وہ اس طرح کہ میں نے آج بھی برادر م محمود النصاری کی بات گردہ میں باندھ رکھی ہے اور ذہنی طور پر میں ہمیشہ حیدر آباد میں رہا ہوں۔ دوسری اور قابل قدر بات یہ ہے کہ حیدر آباد نے مجھے کہی تھا سہیں چھڑا۔ جو جست تجھے حاصل ہے وہ بہت کم ہوں گے جن کے غیبیوں میں آئیں ہوں۔

حیدر آباد میں کوئی ایسی اجنبی ہے جس سے میری وابستگی نہیں؟ کونسا الہما ادارہ ہے جبکہ میری پڑی سیرائی نہیں اور کوئی ایسی مخلص ہے جس میں میں شریک نہیں رہتا؟

حیدر آباد کے اخبار و رسائل یہ رے ذکر سے خالی نہیں ہیں۔ احباب کی تھنوں میں مجھے باد کیا جاتا ہے۔ میں حیدر آباد ہی میں تو ہوں! حیدر آباد سے باہر نہیں، کبھی نہیں۔

یہاں میں ایک اور وضاحت کرتا چلوں، مجھے حیدر آباد سے پیار ہے۔ بلاشبہ بے حد پیار۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ میں دوسرے شہروں سے محبت نہیں کرتا۔

مجھے دلی عذر نیز ہے کہ اسی دلی میں میرے اجداد کی ٹپیاں بُنی ہیں۔ مجھے لکھنؤ میز ز پے کہ اسی لکھنؤ کے لب رہبھر کا میں فرائیقہ ہوں اور مجھے میسور عذر نیز ہے کہ اس میمور کے شباء روز میرے لئے ریگن دپڑہمار ہیں۔ مختصرًا میں یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ لکھنؤ میری آنکھوں کا سترہ، میسور میرے دل کا سر در لور ڈل تو بہر حال دکھے۔ میرا دل!

اور جب میرا یہ دل پھیل جاتا ہے تو ساری دھرتی اس میں محبت آتی ہے۔ اسیرا عقیدہ ہے زمین اللہ کی زمین ہے، یہ حضرت انان کی تنگ دل، تحسب اور کوتاہ نظری ہے کہ اس نے ائمہ کی اس زمین پر بکھریں کھینچ دی ہیں اور وہ بھتائے کہ اُس نے زمین کو ملکوں بیں اور ملکوں کو رہا ستوں میں اور رہاستوں کو شہروں میں اور شہروں کو قریوں میں تقسیم کر دیا ہے حضرت انان کو اپنا ذہن بدلتا ہے اور یہ پہاڑوادیں ہیں ایک دن ٹوٹ جائے گا۔ صرف یہی نہیں کہ حضرت انان کی بنائی ہوئی یہ سرحدیں مرٹے جائیں گی بلکہ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ انان کو ایمان کے حد میان یہ جو دوریاں ہیں، ذات و پات کی، نسل و رنگ کی اور علاقہ دوز پان کی یہ ساری دوریاں ختم ہو جائیں گی اور انان ایک سہوگا، آدم کی یہ اولاد آپس میں بھائی بھائی بن جائے گی۔

۱۰

باد حدتِ حق ز کثرتِ فتنی چہ پاک

سد جائے اگر مگرہ دنی رشته یکے است

(عنی تاگہ میں اگر سو بندگی ہیں دی جائیں تو ان سے ناگے کی وحدت ہاظل
نہیں ہو سکتی..... دراصل یہ تاگہ سے جو گرہوں کی شکل میں تبدیل ہو گیا
ہے۔ اگر یہ گرہیں کھول دی جائیں تو تاگہ ایک ہو گا)

*

میں نے ابھی ابھی جو باتیں کہی ہیں ان با تولد کے پس منتظر ہیں، میں یہ کہوں گا کہ

".... آباد، حیدر آباد رہے۔" میرے چند بات، احساسات اور خیالات کا آئینہ ہے۔

ساف و شفاف اور بسی - حیدر آباد سے متعلق ممنا میں کے علاوہ حیدر دہلی سے مخذلیں
اس مجرورہ میں شامل ہیں ان کی چیزیت رہی ہے جو برائیوں کی ہوتی ہے۔ مگر آپ یہ

مطلب نہ کرایتے کہ برائیوں کی اپنی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دو ہما کی شانک تو اصل میں برائیوں
کی وجہ سے ہی تو ہے !!

طیب الفزاری

* کچھ بہ کوچھ :

میں آباد، حیدر آباد رہے

محمد قلی قطب شاہ نے شہر کی بنیاد کا پتھر زبرد تقویٰ اور پارسائی کی گواہی دے کر
 (جھو ۹۹۹) رکھا اور یہ شہر حیدر آباد فرخندہ بنیاد کہدا یا اُسی وقت مل سے دھانکلہ
 میں اشہر لوگوں سے محروم

اور جب اس نے دیکھا کہ اس کے دل سے نکلی دعا قبول بارگاہ ایزدی ہو رہی
 ہے تو اس کا جی خوش ہوا ہے

لطیف و دلکشا آپ و ہوا ہے
 مبارک منزلے فرخندہ جائے

محان کے علاوہ قلب شاہی دور کے بیشتر شعرا اس شہر فرخندہ بنیاد کے عاشق
 اور دلوں نے تھے اپنے عہدِ زریں کے بڑے شاعر عنوانی نے کہا ہے
 ترا لگر جو حیدر آباد آج اس کا ناموں ہے
 سو بے گماں بے شہر سے او تار بند فتح کا

چار بنیاد کے اطراف پھیلتا پھولنا شہر کچھ عرصہ کے لئے خزان رسیدہ رہا۔ قطب
 شاہی میں دھن والوں کی بیویوں کو گنبد نالہ گستاخانہ کو درہ اپنی دینے لگے۔ لیکن دور زیادہ
 طویل رہ تھا تجھب اور نگ آیا تھا نظم انگلش صوبیوں کو اول نے ۲۷۲۴ء میں نبی سلطنت

کی بناءِ ڈالی اور تھپر پایہ تخت اور نگ آباد سے حیدر بہادر متعلق ہوا تو گئی بہار بوف
آئی۔ اس بہار کو دیکھ کر امیر منائی بے ساختہ کہہ اٹھتے
اٹھتا شد رے بہارِ چمنستانِ دکن
جُو درپر ہے نزدیک جو بنانے کی پری یہ پھین
چمنستانِ دکن مکن اسی پھین کو دیکھ کر جو بھی باہر سے آیا یہیں کا ہورہا اور یہ قول
زبانی زد خاص دعلم ہوا ہے ہے
جو کہ جا پہنچا دکن میں بس دیہیں کا ہورہا
جب سارا ہندوستان زوالِ مغل کے بعد تباہ و تاراج ہورہا تھا اس وقت
یہی شہر ایسا تھا جہاں امن و اماں تھاں
اک دکن میں ایمان ہے درستہ ہے ہر زمین آسمان ہے پیارے
اصل میں حالی نے جو یہ کہا ہے
رعیت شادِ ملک آباد اور آزاد ہر ملت
ادا حق کر دیا شاہ دکن نے حکمرانی کا
تو محض قصیدہ خوان نہیں حسبِ حال تھا۔
حیدر آبادِ اصفہانی دورِ حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی جنت نشان سے
حیدر آبادی تہذیب اور معاشرت مثالِ چیلیٹ رکھتی ہے بہاں ہندو اور مسلمانوں
میں کوئی فرق، کوئی امتیاز نہیں ہے بقولِ داعی
شیوه راستی الیما ہے دکن میں ایسے داعی
بل نہیں رکھتے مسلمان سے ہندو دل میں
حال نے تعریقِ مزید کر دی ہے

پاکتی 'ہندو' مسلمان ہو سکی ہو کوئی
ہے دکھی کو ہر کوئی اپنی ولایت جانتا

حیدر آباد بھروساری رعایا گزاری دلایت پر ہے اپنی برادرانہ فضاء اور پُر امن ماحول کئے
ہندوستان بھر میں مثالی حیثیت رکھتا ہے حیدر آباد کی یہ ہندوستانی تہذیب قطب شاہی
اور اکسف جاہی بادشاہوں کی انصاف پسندی اور انسان دستی کا نتیجہ تھی چنانچہ
آزادی کے بعد بھی حیدر آباد اپنی روایتی صلح کل مگ پالیسی کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے
انسان تو انسان اس شہر میں حیوان تک ایثار سانی اور ظلم دستم سے محفوظ ہے پس چنانچہ
راستے گرد چون دکس سیکھنے والیں واقعہ بیان کیا ہے "اہلیانِ دکن کے ذہن سے وہ
واقعہ کبھی نکلنا سکے لگا کہ سوری مبارک کے گذتے وقت موٹر کی زد میں ایک بھکی آگئی
تھی فعلی سُجلانے پر لفڑی نفیس اس کی تیارداری کا حکم صادر فرمایا اور بعد علاج اس کی
خبر گر کے لئے دیورِ حجی میں منتقم کرادیا۔

کہنے کو حیدر آباد میں مسلمانوں کی حکومت تھی لیکن ان مسلمان بادشاہوں نے ہمیشہ ہندوؤں
اور مسلمانوں کو اپنی اولاد تصور کیا۔ آصفِ سماجع میر خٹمان علی خاں کے بارے میں تو آج بھی
ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ ہندو اور مسلمان کو اپنی دو آنکھیں کہا کرتے تھے۔ مطلقاً العناوی کے اس
دور میں بڑے سے بڑے عہدوں سے ہندوؤں کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اچھے وزارتِ عظمیٰ
بندوقات ہندو فائز رہے۔ راجہ رکھن ماتھ دا کس بہادر، راجہ پرتاب دفت بہادر، راجہ
چندرو محل بہادر، راجہ رام بخش بہادر، ہمارا راجہ نزیندہ پرشاد بہادر اور ہمارا راجہ پرکشن پرشاد
بہادر تو در مرتبہ مملکت، سلطنت کے دزیرِ اعظم رہے آصف جاہی سلطانیں کے صلح کل ملک
کی تو شق آصفِ سماجع کے اس فرمان سے ہوتا ہے "و بہ حیثیتِ رئیس میں ایک دوسرا
مدہب بھی رکھتا ہوں جس کو صلح کل کے نام سے موسم کیا جائیں گے کونکے میرے زیرِ سایہ

مختلف مذاہب و فرقہ کے لوگ بستے ہیں اور ان کے معابر کی نگہداشت میرے آئین سلطنت کا ایک زمانہ سے دلیرہ رہتے ہیں۔ ”چنانچہ اس قول کی تصدیق ان اعداد دشمن سے ہوتی ہے جو منار و مساجد کو قبی امدادی گئی۔ اور آثار قدیمہ کی حیثیت سے بھی مختلف مذاہب کی مقدس عمارتوں کی حفاظت کے لئے رقمیں منتظر ہوئیں۔

ریاست حیدر آباد میں گرجاوں کے علاوہ تقریباً پچاس ہزار مذہبی ادارے تھے جن میں سے (۳۲۵.۹) کا تعلق اہل ہند اور (۷۷۲) کا تعلق مسلمانوں سے ہے اس نمرے میں (۴۰۰) مسجدیں شان ہیں۔ سرکاری خزانہ سے سالانہ (۱۱۲۸) روپیوں کی نعمت معاشریں اہل ہند کے مذہبی اداروں کے لئے اسی طرح (۸۴۹۲۸) روپیہ مسلمانوں کے مذہبی اداروں کے لئے گرجاوں کو (۱۸۸۲۹) روپیہ ملتے تھے۔ اس کے علاوہ اہل ہند کے (۱۱۳۵۵) اور مسلمانوں کے ۲۷۵ مذہبی اداروں کو ترتیب وار (۳۱۹۲۶) روپیہ اور (۲۵۱۲۶) روپیوں کی امداد ملی تھیں۔

مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کو بڑی بڑی چاگریں عطا ہوئیں اور گاؤں کے پیش و پیواری تو اکثری ہوا کرتے تھے۔ کہنے کو تو حیدر آباد پر نظم کی حکومت تھی میکن اصل حکم تو گاؤں کو بھی دیشمکھ، دیشپانڈے، پیش اور پیواری ہوا کرتے تھے۔ ان ہی حقائق کا اختراف بہار اجنبی نے بھی فرمایا ہے۔

”بیردنی اشخاص کو ہمارے اندھی معاشرے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے جب یہاں ہندو ہر طرح سے امن و عافیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو کوئی لوگ سمجھے میں نہیں آتی کہ بیردنی اسی کو یہاں کے باشندوں سے ہمدردی کیوں ہے وہ کوئی حقوق میں جو نہیں حاصل نہیں سا ہو کاری ہماری ہے، دیشمکھ ہم ہیں۔ دیشپانڈے ہم ہیں۔ زراعت ہماری ہے تجارت ہماری ہے عرض زندگی کے ہر شعبہ پر ہم قابض ہیں۔“

حیدر آباد کی بھادہ مشترکہ تہذیب ہے جن کی وجہ سے بقول محترمہ روڈ اسٹری
”یہاں کے پرشاد اقبال اور نارائیں محبوب کہلاتے ہوئے خوشی اور سرت حسوس کرتے
تھے۔“

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا اور ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد اس عظیم اشان ملک کا ایک
اٹوٹ انگ بن گیا۔ حالات سازگار ہوتے، فضاء بدی اور پھر صلح کل کا محل بنا۔
ہندو مسلم پھر ایک بار بھائی بھائی بنت، حیدر آباد پھر ایک مرتبہ رشک جنت بنا۔
آزادی کے بہت بعد پچھلے برسوں باڑ مخالف کے چند جھوٹے چلے، گلی کوچوں میں معصوم
کاخوں بہا مگر یہ کہ یہہ منظر عارضی تھا اب ہمارا شہر فخرِ کالکتہ دمدرس و نظیرِ لندن ہے،
روکش چین و ختن، غیرت بخدار دھمن ہے اور جسے اقبال نے ہندوستان کا دل کہا ہے
میری دل سے یہ دل یوں ہی دھڑکتا رہے کہ دھڑکن زندگی کی علامت ہے۔
حیدر آباد جب تک دھڑکتا رہے گا ملک کی زندگی کی ضمانت ملچ رہے گی۔ اس حقیقت
کو میر آنس نے بھی خواب سمجھا تھا۔ اسی لئے دست پُدعاہے سے
سر سبز یہ شہر فیض بُشیاد رہے
یارب آباد حیدر آباد رہے

حیدر آباد

دیدہ و شنیدہ

مہتممین کھلیں تو عودہ گل کا ما حوال تھا اجدار نے قضاۃ دہلی چھوڑی اور دربار دہلی کو ٹھکرا کر خانقاہ نظام الدین کو مرکز لوز نظر بنایا پھر تک وطن کر کے دولت آباد پہنچے اور قلعہ آباد کو ابدی آرام گاہ بنایا۔ حضرت فخر الدین انصاریؒ کے فرزند دلبند حضرت شیخ حندوم علاء الدین انصاریؒ نے دکن میں مسلمانوں کے قبلہ اول گلبرگ سے قریب اللہ مشریف میں معہ اپنے ہتھیوں کے بُود ر باش افتیار کی محمود شاہ بہمنی کی ارادت اور منک سیف الدین غوری وزیر گل کی عقیدت نے اللہ کو مدینۃ ثانی بنانے میں معاونت کی اور اب جو احوال تھا وہ بڑا روح پرور اور ایمان انفراد تھا۔ لیکن ابھی ہوش سمجھانے بھی نہ پایا تھا کہ اپنے بڑے بھائی جانب میمین الدین انصاری (ایڈ و کیٹ) کی تھی سے ایک ایسے شہر میں پہنچا جو تہذیب و تمدن کا مرکز اور علم و ادب کا محور تھا حیدر آباد میں۔ سیگم بازار کا محل مخفی تجارت کا مرکز بھی ہیں بلکہ اپنے علمی و ادبی احوال کی وجہ سے امتیاز خاص بھی رکھتا ہے پر وہ ذہن پر ایک ایک تصویر انجھرتی ہے۔ پہنچن کی باتیں ناقابل فراموش بھی ہوتی ہیں۔ سیگم بازار کی چھڑی سے گورہ محل کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر میں نے دیکھا میری ہی ہٹر کے چھوٹے چھوٹے گورے سانوں سے سلوٹے پکے خاکی وردی پہنچے مارچ کر رہے ہیں اور میں کا نوں میں جو بات اب بھی محفوظ ہے وہ

بھاکر کسی نے کہا حضور نظام کی سواری گذر رہی ہوا اور کوئی شخص انگلی ٹھاکر کہے کہ "ذکر یاد بخود رہے ہے ہمارے سرکار! تو انگلی کاٹ لی جاتی رہے اور سچھ رہت جلد میں کسکر کافن نے یہ بھی سننا کہ "اب حضور نظام پادشاہ نہیں رہے" یہ بات یہ رہی بھائی کلیم الدین انصاری نے اس وقت کہی تھی جب وہ اور میں بیدار دار مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کر رکپے تھے اور صحن میں کھڑے ہیئت دیکھا۔ پہلی مرتبہ میں نے جو کلام سُنا تھا وہ مخدوم کا تھا۔ ایکشن کے کسی جلسہ میں مندم ہمکر ایک کرپڑہ رہتھے ہے

یہ جنگ ہے جنگ آزادی

مخدوم کے شعر سے زیادہ ان کی آداز نے مجھے تراویہ دیا تھا۔ یہ بالکل نیماحول تھی زندگی کے نئے ترانے گائے جا رہے تھے۔

ہمارے بھاگ بازار میں "پکوں کی بزم" ہوا کرتی تھی۔ ہمارے رہنمائی کااظم تھے اس طرح کدنم شاید ہی کسی محلہ میں رہی ہو۔ کھیلوں میں ٹیبل ٹینس، ہکر کڑ، ہانڈاں اور کبڈی۔ اور کہڈی میں تو ہماری ایم سارے محلوں کی بیویوں میں بھیشہ سبقتے جاتی تھی ان کھیلوں کے علاوہ لوں پاٹ، پچر کلربلا اور گھریوال جیسے کھلی بھی ہم نے کھیلے ہیں یہوں کااظم صاحب اپنی نوعیت کا راہنما خبر۔ پچن "بھی نکالتے تھے۔ صہافت سے رغبت پچن کی تیاری دین ہے۔ تحریری دلخیری کا مقابلے اور ڈرائی بھی ہوا کرتے تھے۔ پچن کی اسی تربیت نے پیغمبر آنکے پڑھایا ہے پکوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کے لئے اس طرح کا ماحول بن جسہ فرزد کہے۔ میگم بازار سے تکالوز کی تعین نہ ہوئی تو چار لگھاٹ مڈل اسکول میں دا غلط ہوا اور شہر کی سب سے خوبصورت اور زندگی میں ایک نہ رک نہیں پہلی مرتبہ متعارف ہوا۔

طیبہ روڈ ڈھیلے ہے میرے قلب دذہن میں رپچ بس گئی ہے انہی سڑک سے بہت سی یادیں

وابستہ ہیں۔ اس سڑک کی دمتعت اور حسن جیسے میری زندگی کا سرمایہ ہیں چار رجھائیں
ہائی اسکول میں جب پڑھتا تھا تو راستے سے گذرتے اور یونیورسٹی پر حسرت سے نظر
ڈالتا گزر جاتا۔ آگے چل کر یہی ہو ٹا میری زندگی کا حصہ سن گئی تھی۔ کتنی یادیں اسیں ہیں
ہیں جواب (جی) قلب و ذہن میں کرب کی کیفیت پیدا نہیں کرتیں ہیں۔ مذکول اسکول ہی کے
زمانہ سے احمد علی کی کتابوں کی دکان پر آتا رسائل کی ادائیگر رائی کرتا اور اگر کسی اخبار یا
رسالہ میری اپنی کہانی چھپی ہو تو خریدتتا۔ ایک رفع کا دافعہ ہے کہ احمد علی کی دکان سے
بغل میں کتابوں کا بستہ نشکایا ہوا اور نیک کے جیب میں انڈیں کا جو، جیب میں باقاعدہ ڈال
کر ہونا، پھل کھاتا اسکو جا رہا تھا انٹروں کے بعد ہمیں طلاس، انگریزی کی تھی۔ جماعت نہ کا
طاویں علم تھا اور انگریزی کی اندری عبد الرشکو، صاحب پڑھایا کرتے تھے۔ کلاس رفت کے
”داڑھ پر پہنچا۔“

”MAY I GET IN SIR?“

”اپ ماہر ہی تھرئے“ شکور صاحب نے گرج کر کہا۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا۔
شکور عبد العبد نے تحریکی تہبید کے ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ میں پر پشان کہ ”آخری
شوو کیا ہے؟“ اس سوال پر انھوں نے پوچھا ”تمہاری جیب میں کیا ہے؟“
میں فوراً کچھ گیا۔ میرا رجھک گیا۔ وہ کہنے لگا ”تمہیں بشم ہیں آتی اس طرح سڑکوں پر کھاتے پھرتے
ہو۔ یہ ہر تمیزی کی بات ہے۔ آئندہ سے اگر میں تمہیں پھر اس طرح دیکھوں گا تو...!“ اور
پھر وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے سر جھکائے اپنی جگہی۔ سوچتا ہوں اس طرح کے اساتذہ اب
ہمارے اسکوں میں یوں نہیں ہیں!۔ مذکول اسکول میں جب تک تھا کلاس مانستر تھا۔ سفلو
علی مرز اصحاب اور فضل اللہ صاحب کی شخصیتوں کے خد دخال نہیاں ہیں کہاں اسکول میں صود
صدیقی اور قدرت اللہ بیگ صاحبان نے اُرد پڑھایا تھے۔ ہمکری صاحب بھی انگریزی پڑھایا
کرتے تھے۔ انکی مشفقانہ تنہہ ہمیشہ یاد کی رہتی ہے مسعود رضا صاحب اللہ کو پیارے ہوئے

بڑی مرجان مریخ شخصیت کے مالک تھے وہ اسکاٹ ماسٹر تھے ڈریل کے صاحب صاحب ڈرانے بھی کرایا کرتے تھے چادر گھاٹ ہائی اسکول کے ڈرامے اپنے دور میں مشہور تھے اسی زمانہ میں ہنوں نے ایک بات ایسی بتائی تھی جو ہم نے اپنی گھر میں ہاندھ رکھی ہے۔ "بل میں بل اپنا بار، پر ایا بار چوٹھے میں جل" اس ذہن کو اقبال کی شاعری نے آگے چل کر بڑی تقویت اور طاقت بخشی ہے۔ اقبالیات کے سلسلہ میں "روحِ اقبال" کو فراموش نہیں کر سکتا۔ ابتداء میں "جہاں اقبال" کی درسے بھی میں نے اقبال کو سمجھا ہے۔ ابتدائی زمانہ میں ہی میں شبیل اور ابوالکلام آزاد کو پہمہنڈ بڑھا ہے۔ شبیل کی الفاروق اور آزاد کی غبار خاطر نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ ہائی اسکول ہی کے زمانے سے لکھنے پڑھنے کا شوق بہت تیز ہوا اور کھیل کو دس سے دوسرہ تو تاگیا۔ تقریری صلاحیتوں کے اچاگر کرنے میں میرا سعد علی صاحب جو ہمارے دامن پرنسپال تھے، اہم کردار ادا کیا ہے ان کا طریقہ بڑا عجیب و غریب ہوا کرتا تھا۔ اسکوں میں مختلف جملے ہو اکتے تھے خدا یوم آزادی، یوم جمہوریہ، درخت اگاؤ، غیرہ۔ ایسے موقعوں پر وہ ایسٹچ سے اچانک میرانام تقریر کئے پکارا کرتے۔ میں حیران دپریشان ایسٹچ پر پہنچ جاتا اور جو سمجھے میں تھا کہہ گزرتا۔ اکثر میں نے اجتماع بھی کیا اور کہتا رہا کہ آپ قبل از قبول کہا کریں۔ مگر وہ کہتے اسی طریقے سے تھاری تربیت ممکن ہے۔ اقبال زیدی صاحب تاریخ پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے طرزِ تدبیح نے مجھے متاثر کیا ہے اسکوں میگزین کا سب ایڈیشنر اور میٹرک میں جب پہنچا تو بزمِ اردو کا صدر بھی بن گیا۔ وزارِ العلوم کا کوچ سے میں نے پی لوسی اور بی۔ اے کیا ہے۔ سی دوسریں پرسہ فیصلہ سید علی اکبر نے میری مدد کی۔ میں ان کے احسانات کو زندگی بھر فراموش نہیں کرتا وہ اپنی صلاحیتوں کے بڑے قدر داں تھے وزارِ العلوم کا بع کے ایسچ کے بننے میں ان کا حصہ بڑا گھاٹا قدر ہے۔

نگہداں کے زمانہ میں جو کہانیاں میں نہ بڑھی ہیں وہ بڑی طسماتی اور ریگن ہوا کرتی تھیں

حیی و جمیل حوروں اور خوبصورت شہزادوں کی کہانیوں میں ایک ٹلسماںی شہر کی تعریف سترہ ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت مجھے ابھی یہ اندازہ نہیں تھا۔ جس شہر میں میری پروپریٹی ہو۔ ہی اپنے اور جس شہر کو میں نہ صرف یہ کہ میں دیکھ کر رہا ہوں بلکہ جس کا ایک حصہ بتا جائے ہو۔ اُن کتابی شہروں سے کہیں زیادہ سیو دجمیل اور فیجن ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کس طرح ہمارے بزرگوں نے اس شہر کو خون بجگد دیا ہے اور یہ کہ ہم اپنے خون دل سے اس کی دینہ دری اور خوبصورتی میں اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ حیدر آباد کی روشنی اور پہاڑ میں چہار شاہوں، فن کاروں، دانشوروں، شاموروں اور ادیبوں نے اپنا ہوشائی کیا ہے۔ وہی میری طرح کے نوجوان کا حصہ بھی ہے یہ حصہ چاہئے کتنا ہی حقیر اور محتالی ہی کیجاں نہ ہو بہر حال ہمارے لئے بڑا ہی اہم ہے میرا یہ احساس ہے کہ میں اس شہر کا تماشائی نہیں ہوں لیتا انگ ہوں، ایک ایسا جذبہ جسیے حرب مکر کی طرح شایا نہیں جا سکتا ابھی تو ہم اپنے کام میں جٹھے ہوئے ہیں۔ ابھی تو ہمیں بہت کچھ کرنا ہے اس لئے میری اور میرست طرح کے رجوانوں کی بارت اور ان کا کام ادھورا ہے۔

حیدر آباد کی پہچان اس کی دو تہذیب ہی نہیں ہے جو مخلوقوں سے عبارت ہی اور جس کی بناء پر پہچان کی تہذیب کو مغلائی کہا جاتا تھا اور نہ دو تہذیب جو قطب شاہوں کا عطا کردہ درخت ہتھی۔ حیدر آباد نے اپنی کو کہتے ہوئے خود اپنی ایک نئی تہذیب کو جنم دیا تھا اور یہ تہذیب ہر طبق تغیر پذیر ہی ہے چار منیاں اور مکہ مسجد لیقیناً حیدر آبادی تہذیب اور فن تعمیر کے نمونے ہو سکتے ہیں پرانی حولی اور خلوات کی زبان اور لکھراہی حیدر آباد کے لئے ہمیشہ باعث افتخار رہا ہے لیکن عہد آخر میں جو امور غشاہیہ ہماری تہذیب کی حقیقی پہچان بن گئی جب میں اس جاموں میں پڑھتا تھا تو اس کا عہد ختم ہو چکا تھا مگر پھر تب بھی بو لئے تھے اور جو قوبے کا نت رکھتے ہیں وہ آج بھی سُننے ہیں۔

اہج بھی ان خاموش اور سچاٹ پھروں پر ٹیکھی تک ٹوپی اور ڈسھے اپنے رُنگ کی صاف
بُخنوں والی کالی شیر وان میں بلوس نوجوان بڑے ہی ترنگ میں نظر آتے ہیں۔ میں
نے خود اپنے ناخنوں سے اپنی ہی کتنی تصویری بنائی ہیں ۱۹۶۷ء میں جب میں بزم اردو
کا صدر تھا باقی جامعہ کا انتقال ہوا۔ کامرس مال میں جلسہ تعزیت کا انعقاد عمل میں
آیا، یاد دینہ نم میں نے حیدر آباد کی جدید تہذیب کے اس عظیم ممتاز اور علمبردار کو خراج
غصیدت پیش کیا ہے مجھے وہ منظر اب بھی یاد ہے جبکہ اس عظیم شخصیت کا جس نے
شاہی میں فتحی کی تھی، کام خاری دیدار کیا تھا۔ کنگ کوٹھی میں انسانی سروں کا ایک
سمندر تھا جو شخصیں مار رہا تھا۔ نہروں آنکھیں لکھیں جو اشکار تھیں۔ سو گوارچہ کے
اپنے آتائی موت پر مرجانے ہوئے تھے۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان مرحوم ان معنوں
میں بھی حقیقی حمد آباد تھے کہ کسی بھی جمپوری اور عوایی قائد سے زیادہ عوایی تسلیت
رکھتے تھے چنانچہ ان کے سو گواروں میں مزبجون، مجبوروں اور بے کسوں کی تعداد زیادہ
تھی۔ اصل میں میر عثمان علی خان کی موت ایک تہذیب، ایک لکھر کی موت تھو۔ وہ کسی
محروم بادشاہ کی موت نہیں ایک ہمدرد زرین کی موت تھی ایک ایسے عہدکی موت جو نہ لان
لکھ رہے عیاست تھا۔ سعوط حمد آباد کا راتھ ۱۹۲۸ء میں نہیں بلکہ ۱۹۶۷ء میں عمل میں
آیا۔ یہ الہاسان نہ تھا جس کو عیدِ آباد کے تمام شہریوں نے یاد دینہ نم برداشت کیا۔
تلگر کو میں چودھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں علام الدین حسن نے جس لکھنگ جمنی تہذیب
کی بندر و کھی تھی آئی تہذیب کے میر عثمان علی خان آخری ممتاز تھے میر عثمان علی خان
کا عہد نہیں بقینا میر سے لئے شیندہ ہے ملکنا جن لوگوں نے اس تہذیب کی برکات
سے استفادہ کیا ہے ان میں میری اختر کے نوجوان بھی شامل ہیں۔

۱۹۴۷ء کے پہلی سیاسی تبدیلیاں اکثر مسلم فوجوں میں فساد ذہنی کا ہوا تھا۔

بے روزگاری کے یقینی، مذہبی تعصب اور انسانی تنگ نظری کا مقابلہ ٹڑا جانکا ثابت ہوا۔ اکثر نوجوان تلاش روزگار میں پاکستان کی اراضی اختیار کر چکے تھے اور جو تھے ان میں میں بیشتر کمیونزم کا شکار ہو رہے تھے۔ ایسے میں سید خلیل اللہ حسینی صاحب اور ان کے نقادر نے بزمِ احباب کی بناء ڈالی اور پھر تعمیرِ ملت کے کام میں جوڑ گئے۔

حیدر آباد کے علمی و تعلیمی ماحول میں ۱۹۶۵ء تک بھی بین الکلیاتی تحریری و تقریری قابلوں کا روایج عام تھا۔ بزمِ ادب کا چیکوڑہ، اجمن ہندویہ، تعمیرِ ملت علی آباد اور عثمانیہ گرجوٹیں اسکوی ایشن کے علاوہ نظام کالج، اوزارِ العلوم کالج، نانک رام بھگوان دکس کالج،

ممتاز کالج، نیوسائنس کالج اور آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی کے زیرِ اعتماد بین الکلیاتی تقریری مقابلوں کے انقاد نے طالبِ علموں میں تقریر کا ذوق پیدا کر دیا تھا جس طرح ابتدائی زمانہ میں میراسد علی صاحب نے میری ہمت افزائی کی تھی اسی طرح آگے چل کر خلیل اللہ حسینی خدا اور پروفسر علی اکبر صاحب نے حوصلہ بڑھایا ہے۔ رہنمائے دکن کے "بچوں کا صفحہ" میری ادبی زندگی کی ابتدائی جولان گاہ بنا پھر روزنامہ "سیاست" کے احانتات بیش بہا ہیں جگروں اور عابد علی خان صاحب کی ہمت افزائی نے میری طرح کے بے شمار نوجوانوں کو بڑھا دادیا۔

ہے ذاکرِ ذریمے استاد کبھی نہیں رہتے لیکن ان کی ذات میر سے یقینی ہمیشہ علم و عمل کا صریح پیغمبر ہے وہ میرست لئے تحفظ شنیدہ رہتے دیدہ اس طرح کہ ان کا دیدار کرنے والوں میں میں بھی شامل ہوں۔ ذریمے صاحب ایسی شخصیات کو دیکھ کر جی نیس کہنے پر جبود ہوتا ہے کہ اگر اہل یونان افلاطون، سقراط اور ارسطو پر نازک کرتے ہوں تو یا کریں ہم اہل حیدر آباد تو ذریمے صاحب ایسی شخصیتوں پر نازدیک ہیں۔

حیدر آباد کی علمی و ادبی اور خصوصاً اردو زبان و تہذیب کو نازک دقتی میں جن لوگوں نے سہارا دیا ان میں مولوی عبد الحق، ذاکرِ ذریمے، پروفسر سروری اور مولوی سید محمد

مُسحود سین خان، حفیظ قیتلن، زینت ساجدہ کا نام نمایاں ہے ابھن کی تشكیل میں موادی
حبیب الرحمن اور ان کے دیکھ سائنسیوں کے علاوہ جناب عابد علی خان نے جو جو حکم مولیٰ یا وہ تائیخ
ادب اردو کا ناقابل فراموش واقع ہے خصوصاً آزادی کے بعد اردو کے بڑے ہریے مرکز
جہاں اہل زبان ہو اکستے تھے اردو سے منہ مولڈ کر غیر زبانوں کو اختیار کر لیا تھا۔ ایسے
نازک حالات میں جہاں زور صاحب اور ان کے رفقاء ادارہ ادبیات اردو کے تحت
ادبی روایات کی بازیافت میں صرف تھے وہیں جناب حبیب الرحمن اور ان کے رفقاء
زبان کی ترقی اور تحفظ کے کاموں میں ڈٹ سے گئے تھے۔ کچھے چند برسوں سے جب کہ
زور صاحب ہم میں نہیں رہے ہیں اور جناب حبیب الرحمن صاحب ضعیف ڈیں عابد
علی خان صاحب کی ذات حیدر آباد کی تہذیب اور ادبی زندگی کا مرکز و محور بن گئی ہے۔
روزنامہ سیاست کے ذریعہ وہ اور ان کے رفقاء کا رحباً محبوب چین جگرنے اردو صحافت
اور اردو تہذیب کو عصری مسائل اور عصری تعاون سے جہاں ہم آہنگ کیا ہے وہیں زبان
ادب کے فردغ میں اپنا کلیدی حصہ ادا کر رہے ہیں اس سلسلہ میں بحثیتِ مجموعی حیدر آباد کی
صحافت ہماری تحریف و تختین کی ہر طرح صحیح ہے مجھے یہ کہتے ہیں کوئی تلف نہیں کہ
خہدِ گفتہ شہر میں آصف سلیمان میر عثمان علی خان نے جس طرح اردو زبان کی ترقی میں اپنی دلچسپی
و کھاتی تھی اور جو کارہائے نمایاں انعام دیجئے تھے وہی کارہی عوامی امداد میں جناب میر
عبد علی خان صاحب انعام دے رہے ہیں جناب عابد علی خان نے جہاں ابھن ترقی اردو زندہ
حیدر آباد، اردو بال، اردو ماؤں اسکول کا قیام اور اردو گھر رہست کے ذریعہ اس عوامی
دور میں کام کرنے کے ڈھنگ کو بتایا ہے وہ ہندوستان بھر کی اردو عوام کے لئے قابل
لتفہید ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کے رہست کے قیام میں ان کی اہانت زور صاحب
کی خدمت میں ان کی طرف سے زبردست عقیدت کا انلہار ہے اس سلسلہ میں جہدی نہاز جگہ

محمد علی عہدِ اسی راجح بہادر گورنر اور مکٹ محمد المذاں کی خدمات ہر طرح قابلِ تحسین پڑیں۔ آج کا حیدر آباد جدید اُن تمام اکابرِ ادب کو کبھی نراموں نہیں کر سکتا ہے کا کہ ذکر میں نے اپنے اس مختصر سے مضمون میں کیا ہے اور ان بزرگوں کو کبھی نہیں جن کا ذکر میرے نوکِ قلم سے دُر ہے!

محمد قطب شاہ نے شہرِ حیدر آباد کی بنیاد کا پھر زہد، تقویٰ اور عبادت کی گواہی دے کر رکھا تھا اور دعا کی تھی کہ اس کا یہ نو آباد شہر لوگوں سے کچھ اس طرح آباد رہے جیسے سمندرِ مچھلیوں سے آباد رہتا ہے چنانچہ عہدِ قطب شاہیہ اور عہدِ آصفیہ میں حیدر آباد رشکِ جنت بنتا گیا۔ اب بھی یہاں کی تہذیب اور معاشرتِ شاہی حیثیت رکھتی ہے ہندو مسلم اتحاد اور حیدر آبادی پگانگت و محبت کا بثوت اب بھی یوں دیا جا سکتے ہے کہ آج کی اس محفل کے داعیوں میں جانبِ رعنی راجح مکینہ کا نام توازن برقرار نہ کئے ہوئے ہے اصل میں اردو تہذیب ہی حیدر آبادی تہذیب ہے اور اردو تہذیب مشترک کہ پھر کا نام ہے جب تک روداری، انحطت اور بھائی چارگی کے یہ چیزیات و احساسات ہم یہیں رہیں گے شہرِ حیدر آباد کی رونق ماند نہیں پڑے گی اور نہ یہی اس کی بھار پر آپنے آئے گی۔ اُنیس کا ہم زبان ہوں اور دعا گو ہوں ہے

اللہ در صونِ حق کی امدادر ہے

سر بزر یہ شہر فیض بنیاد رہے

خوب ایسا رہیں انتظام ایسے

یارب، آباد حیدر آباد رہے



(لجم زدہ منعقدہ ۷ ارنسٹر ۱۹۸۵ء میں پڑھا گیا)

حیدر آباد

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی

۶۴۵ء میں جب شمالی ہند میں آزادی کی تحریک شعلہ بدامان تھی اس وقت حیدر آباد میں بھی اس کی چنگاریاں حریت پسندوں لئے آزادی کے متوالوں کے دلوں میں حرکت اور حرارت پیدا کر رہی تھیں۔ نبیض محمد نے اپنی کتاب "صالار جنگ" میں تھاہیہ کر کہ "برطانوی حکومت ہند کی کمی مخالفت کی جانے لگی پر بھر گھر رہی کے چرچے تھے۔ بدستی سے اس نکلنے میں حضرت نواب ناصر الدین بیہار نے حکمت فرمائی تو اور بھر پر بیان اس پر مسودہ ہو گیئی۔ میر داد علی دانش نے "ریاضِ محنت" (سلطنتِ اصفیہ) میں قدر سے تفصیل ہے اس واقعہ پر دشمنیِ ڈالنے ہوئے تھے کہ "اوزنگ آباد کے چند مفسد متعلق خدے جو پہاں اسکر گرفتار ہوئے تھے انہیں حضور نے سرکار انگریزی کے حوالے کر دیا تھا تو پہاں کے عوام انساس کو سخت ناگوار ہوا تھا اور انہوں نے فور پر بھر ایک کو جوشی جہاد پیو اہو گی تھا جسی کہ حضور پر نورِ حضرت مکان اور مدارالمہام مخفی رکود ہمیکی دی گئی کہ انگریزوں کے خلاف اس وقت بیہار نے کیا جائے گا تو ہم شاہ و وزیر کی جان کا خانہ بھر گز نہ کریں گے مگر اُن فریں ہے دئیں و دلوں پر کہ بھر اس کو بٹان پس قتے نہ دیا اور کمبل استقلال سے بن دیست۔ کیا فوج باتا کندہ قر اس وقت تھی انگلستان کے بعد اردو کی تائیف قلوب کر کے جلد روانہ ازول پر شہر کے سرپ

بُشہاد ہے کئے اور حکم دے دیا گیا کہ جس کو ہنگامہ آراؤ دیکھو گولی مار دو۔ باوجود اس اعتمام کے طور پر باز خان بر فراقت مولوی اعلاء الدین پاپ سور وہیلے فراہم کر کے آئے ہنگامہ آمدی ہو گیا چنانچہ اس شوال روز جمجمہ ۳۷، ۱۸۵۷ء مطابق ۷-۱۸۵۶ء میں دوپہر کے بعد دہلی دروازہ کی راہ سے صحیح ہمراہ چلا۔ او باشی بلده تو ایسے وقت کے منتظر ہی تھے ہر ایک سخت سے جو قدر جو ق نکل کر ان میں شامل ہونے لگے تا آنکہ رفتہ رفتہ پانچ ہزار کے اندازہ میں وہ جمع ہو گیا مغفور اول رسالہ جنگ ہنسے دیکھا کہ اگر اس ہنگامے کو روکیں تو لامحا کشتو خون ہو گا اور یہ روہیلے وغیرہ او باشی بلده ہی میں بوٹ مار شروع کر دیں گے ہندہ بکمالِ دانائی و دُورانہ یشی ای بلو ایمیں کے معرض نہ ہوئے مگر یہ کیا کہ پیش از پیش کرنل ڈیوڈ س رزیڈ نٹ بہادر کو مطلع فرمایا کہ اپنی حفاظت کا انتظام کر لیں۔ ”رسالہ رویداد حیدر آباد دکن“ سے ظاہر ہے دیز بعن من لوگ (انگریز) اس زمانے کے بیان کرتے ہیں کہ عربی اور تہی اور لڑکیاں گل رخسار اپنے اپنے بنگلوں سے لکھ کر مانند ابرہما راشک ریزان حواس باختہ افتاد و خیزان رزیڈ نٹ بہادر کی کوٹھی میں پناہ لینے کو چل چاہی بھی نہیں۔ رزیڈ نٹ بہادر نے بھرو اطلس ہنگامہ مذکور کوٹھی کی فوج کو متعدد کر لیا اور مکنند آباد سے بھی جمعت آگئی میجر گرس نے دو توپیں کوٹھی کے دروازہ غرب روایہ کے باہر لا کر لیں رکھا تا آنکہ بلو ایمیں کی فوج یعنی آگے روہیلے اور ان کے پنجھے شہر کے اوپا شن۔ کوئی سپر تلوار لئے بٹا ش کسی کے پاس کہنہ بندوق، اکثر لیٹیں اور مانسے نئے ہوئے دین دین کہتے ہوئے گولی گوڑہ ملک پنجھے صرہ باز خان کے خاص خاص جانہاں سب سے آگے۔ پتلیوں کی باؤلی کے پاس پہنچتے ہی ایک توپ گویا اسلامی کی میجر موصوف نے سر کی میگر از راہ انسانیت پہلے فائز ہوائی کیا کہ در کر پڑا جائیں جب دیکھا کہ بد معالشوں پر مطلق اشرمن ہوا اور دہی جنمات باقی ہے تو دوسرا فائز کیا من میں نہیں ہر کیا جس سے کئی مر گئے اور کئی مجرد حج اپنے خون میں لوٹنے لگے۔ یہ دیکھ کر اعیسیٰ جانہلاں طرف ہاٹ

نے مرا ثابت علی کے مکان میں جو دیکھ لے تو تھے بناہ میں اور پہنچ میں قبول نہ کرنے لگے بعقب
کے دین دین کہنے والے جو تھے انہوں نے دیکھا کہ اونتا تو نہیں ہے میاں اپنے خون میں اونٹا
ہے بانے پھینک دی سے اور جو تیار ہاتھ میں ہیں اور سیدھا اپنے گھر کا راستہ نیا چونکا اس
وقت میں ایسے مکانات حائل نہ تھے بلکہ کفر میدان تھا اس نئے بھر گھبرا کر سمجھے دیکھتے بھی تھے
کہ مہادا کوئی گولا یہاں تک آئے اور بھاگے جلتے تھے، طرو باز خاں اور ہمراہ ہمیں کوئی سوچی
کہ مرا ثابت علی کے مکان سے دلواریں پھوڑتے ہوئے کوئی کے دروازہ تک ہبھج جانا چاہئے
چنانچہ جب محمد اعظم علی خاں کے بنگلہ کی دیوار توڑنے لگے تو خان مذکور نے فی الفور
رزیڈنس بہادر کو خبر کر دی۔ بہادر موصوف نے حفاظت کے لئے چند سپاہیوں کو بچھ
دیا۔ اس عرصہ میں شام ہو گئی۔ باغیوں نے دیکھا کہ یہاں کامیابی کی امید نہیں ہذا صبح تک
بیس زخمی اور بیسل کو چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ لفاب صاحب المخمور نے طرو باز خاں اور
مولوی علام الدین کی گرفتاری کے لئے بنم تعلقداران مہارک محدرسہ احکام چاری کیئے اور اشتہار
دیا کہ ان دونوں کو جو بھی گرفتار کر کے لئے گاہر ایک کے لئے پانچ ہزار روپے انعام دیا
جائے گا طرو باز خاں کی خبر اپنے نواحی میں زکھوڑہ کے زمیندار نے جو پائی تو اپنے سپاہیوں
کوئی کر پہنچا۔ زندہ گرفتار ہونا ممکن نہ تھا اس نئے طرو باز خاں کی راز پر گولی ماری جس سے
وہ گر بھرنہ اٹھ سکا اور گرفتار ہو کر سر کار میں آیا۔ سر کاری طور پر اس کا عنایت ہوا۔ روزانہ دو
روپے اسی کی خود و نوش کے لئے مقرر ہوئے تھے اور زخم اس کا چنگا ہو گیا تھا مگر لنگ باقی تھا
براں، ہم ایک روز مورچا کر قہوہ سے نکل آگیتا آنکہ ۱۷۵۷ء میں تعلق توپران کے راستے پر
مرا قریبان علی تعلقدار کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کی لاکش یہاں آئی اور دفن کر دی گئی... اس عرصہ
میں علام الدین مخدوم کوئی بھی گرفتار ہوا۔ اس کو جبور در بائے شور جس دوام کی سزا دی گئی
مندرجہ بالا تفصیل سے طرو باز خاں علام الدین اور دیگر صحابہ مجاہدین کے حالات اور ناقلات

پر کشند پڑتی ہے اور ساتھ ہی اندازہ حیری سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سرکاری دباؤ نی مورخین، جنگ آزادی اور جنگ میں حصہ لئے والوں کے بارے میں کی رائے کھستے تھے جاہدین آزادی کو اباش کہنا دانش کرنے کتنی داشت مندانہ بات ہی نہیں، واقعہ تو یہ ہے کہ ان سطحی بھر" ادباش افراد نے حیدر آباد کو جنگ آزادی سے ہمکار کیا اور خراپی شور کو بیدار کیا ہے حیدر آباد میں غدر کو زکام بنانے میں سالار جنگ نے فیروز محل اہم رول ادا کیا ہے اس ناکافی کی سیاسی اہمیت کا اندازہ ایک انگریز افسر کے اس بیان سے ہوتا ہے "ان پر زور کار دانشمند نے جنوبی ہند کو بچا لیا یوں کہ اگر حیدر آباد ہمارے خلاف ہو جاتا تو اس کے مسلمان بھیسا کر زیڈنسی میں یہ بات مشہور تھی ان کے قدم بر قدم چلا۔" یہ موقع اتنا زیکر تھا کہ بھی کے گورنر نے حیدر آباد کے زیڈنسٹ کو تاریخ بھیجا کہ "اگر نظام آتا تھا سے گئے تو سب کچھ گیا۔ فیض محمد نے لمحہ ہے کہ نظام اور سالار جنگ کی ای قدمات کے صدر میں ٹیکاونی حکومت نے ۱۸۶۰ء میں سرکار نظام کے پاس ایک لاکھ روپیے کے تھائف بھیجے اور سالار جنگ کو تیس ہزار روپیے کے تھائف بھیجے اور ساتھ ہی ان کے مبلغ را چور اور عمار اسیو واپس مل گئے اور شورا پور کا علاقہ بھی حیدر آباد کے لفتشے میں داخل ہو گیا۔ منگر عوام میں سالار جنگ کی بڑی بدنامی ہوئی اور ایک دن جبکہ وہ دباؤ سے لکھ کر زیڈنسٹ کے ساتھ واپس ہوا رہے تھے ایک روہ میلے نے ان پر گولی چلائی اور ہم رکاب جو اون میں سے ایک ان کا نشانہ بن گیا۔ سالار جنگ نے تھی، نظام برسرا نہ اور رہے اور بظاہر آزادی کی آگ کا شندی تو ہو گی تھی یعنی ۱۸۶۷ء میں طرہ بازخان اور ان کے ساتھیوں کا خون رنگ لایا اور بالآخر حیدر آباد آزاد ہندوستان کا ایک جزو بن گیا۔

الوزارہ العلوم کالج

پہلے دنوں کی پاٹیں - چند پیارے

۱۹۵۸ء میں جبکہ میں چادرگھاٹ ہائی اسکول جیسے حیدر آباد کے قدیم اور معروف اسکول سے اپنے ایسی کامیابی کا امتحان پاس کر کے انوار العلوم کالج گردشی ایام کے نوجہ میں پہنچا تھا تو اس وقت یہ کالج ممتاز منشی کی قدیم عمارت سے نکل کر ملے پلی کی نئی عمارت میں منتقل ہو چکا تھا اور پہلے چھتو، عمارت کو بدینکہ کا واقعہ معنوی اعتبار سے بھی کالج کی تعیینی زندگی میں ایک نئے اور اہم مرڈ کا باعث ہوا۔ اس زمانہ میں ممتاز ماہر قلم پر دفیر سید علی اکبر ہنڈلی اور جنلب سید خلیل اللہ حسینی والیس پورنیپل تھے۔ ولی اکبر صاحب میرے لیئے ابھی تھے جملہ خلیل صاحبکی ذات تحریرات کے واسطے سے میرے بیٹے اتنی بھی پرانی حقیقتی جتنی بڑم احباب ہے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انوار العلوم کالج میں طلباء مشکل ہی سے داخلہ لیتے تھے کالج کا ایک بھی بنیتہ نہیں پایا تھا اور چونکہ مالیہ کی فراہمی میں "چرم قربانی پر تکیہ" کیا جاتا تھا اسکے لئے اس کالج کو مرفہ عام میں "چھرے کی کالج" بھی کہا جاتا تھا اور یہ ہاتھ میری طرح ہر طبق علم کرنے باعث شرم تھی۔ یہاں کوئی مشمندگی میں اس وقت کی آئی جبکہ ولی اکبر صاحب اور ارکانی کیئی تھے اس کالج کو سرکاری دینم سرکاری مصلحتوں کے تحت ملے۔ جو کالج ۱۸۶۴ء میں A.A. کا نام دیا۔ نام کی اس تبدیلی نے ذہن کے بوجہ کو ہٹلنے

میں نقیباتی کردار ادا کیا ہے و نیز سرکاری گرانٹس کی منظوری میں شاید یہ بات زیادہ مدد و معاون بھی ثابت ہوئی۔ علی اکبر صاحب نے کانج کی ہمہ جہتی ترقی کا جو منصوبہ بنایا تھا، مخطوط تعلیم EDUCATION ۱۹۶۰ء میں کا ایک حصہ تھی اس نئی بتدیلی نے طلباء کے ذمہوں سے غبارہ ہٹا دیا تھا مخطوط تعلیم کی وجہ سے تصویر کامنات کا رنگ نکھرا آیا۔ کانج کی زندگی میں رنگینی اور پہار آئی۔ اور اس طرح ۱۹۶۰ء میں دو طالبات نے داخلہ لیا۔ مس عالیہ سلطانہ اس وقت کی میری ہم جماعت پہلی طالبہ تھی دوسری غالباً مس ارشیدہ جس نے پی یوسی میں داخلہ لیا تھا۔

علی اکبر صاحب اور خلیل اللہ حسینی صاحب کی دواليٰ شخصیتیں تھیں جو کانج کے استطابی امور میں دخیل تھیں دلوں شخصیتیں ذہنی اور فکری اعتبار سے بڑی حد تک مقنن رہیں اس طرح کانج کی زندگی میں نئی اور پرانی قدروں کے ٹکڑاؤ کے آثار بھی نمایاں تھے تاہم یہ بارت حساس طلبہ پر ہی مبتکشف تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ علی اکبر صاحب کی دوستیہ النظری، سوچنے کا سیکولر انداز اور کام میں نظم و ضبط اور خلیل اللہ حسینی صاحب کی تقریری صلاحیت، اقلیتی ادارہ کے کردار کو بحال رکھنے کی کوشش اور علمی سطح پر اختلاف کے انداز نے کانج کی ترقی میں نمایاں حصہ ادا کیا ہے ان طلباء کو جیسی تعریف دکھری سے دیکھی ہوتی تھی بال و پر لانے کے کافی موافق تھے جناب پی یوسی میں گوئیں سائنس کا طالب علم رہا ہوں اور دوسرے دیکھی پہنچنے میں بھی یہے چنا پڑے پیارگھاٹ ہائی اسکول میں تعلیم کے دران مسعود صدیقی اور مسعود حمزہ صاحب نے دکھری یوسی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور اسد اللہ صاحب والاس پرنسپل نے تقریر کی مشق کے بعد تھار مولع فرامیں کیتھے اقبال زیدی کی صاحب استاد تاریخ کا اثریہ ریاضی زبان اور ذہن دلوں پر ہے اسی زمانہ میں خلیل اللہ حسینی صاحب کی تعریف نے دور دور تک اور دیر تک رہنماں کی۔ یہاں کانج پر انسٹریشنر یونیورسٹی تقریری مقابلوں کا ایک نیا سلسلہ پہلی بڑی اتفاق۔

میدان و سیع تھی اور جذبہ شوق بپڑنا۔ اساتذہ ایسے جو ہر ہر قدم پر بہت افزائی کرتے تھے ہبہ پاکہ یہاں بھی شریف احمد فخری، بعض احتشام الدین کی اور بعد میں خاہد صدیقی کی رفاقت میں ان مقابلوں میں شریک ہوتا اور کئی رو لنگ شروعیں جیتنے میں کامیاب رہا ہوں۔ تقریر کے ساتھ ساتھ تحریری مقابلوں میں بھی میں نے کئی انعامات حاصل کیتے اور ۱۹۶۲ء میں انٹرڈسٹریکٹ مقابلے میں انعام اول حاصل کیا یہ جامیونٹی نے کا سب سے بڑا انسزار تھا تقریری مقابلہ میں اس کامیابی نے کانج کے نام کو ریاست میں نمایاں کیا تھا۔ یہ میری اپنی زندگی کا بھی اور خود میری درس گاہ کی تاریخ کا اہم واقعہ تھا میرے اساتذہ شبھول علی اکبر صاحب بہت خوش ہوتے۔

ایک مرتبہ محترمہ شاہ بھیان بیگ صاحبہ کانج آئیں تھیں علی اکبر صاحب نے کہا بھیجا پرنسپل پیغمبر میں انہوں نے محترمہ سے میرا تعارف کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ ہماری کانج کے ہو نہار طالب علم ہیں بہت اچھے مقرر ہیں چنانچہ انٹرڈسٹریکٹ تقریری مقابلہ میں اول آئے ہیں“ اس طریقے داقویات اکثر دبیشتر پیش آئے جو میری بہت افزائی اور سرت کا سبب ہوئے علی اکبر صاحب کا خیال تھا ان تحریری و تقریری مقابلوں میں کامیابی حاصل کر کے ہم نے اس کانج کا نام ادا پنچا کیا ہے۔ میں اس وقت ان کی بات کو کچھ نہیں پاتا تھا لیکن آج جبکہ میرے طالب علم اس طریقے کی کوئی کامیابی حاصل کرتے ہیں تو مجھے بے پناہ خوشی محسوس ہوتی ہے۔

میں کوئی بہت پرماں بات نہیں کہ رہا ہوں۔ یہی پچھلے دو ایک دہوں کی بات ہے ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۲ء انوار العلوم کانج میں میرا قیام رہا۔ پہلا سال پی یوسی اور باقی یعنی سال ہی۔ میں کی تعلیم کرنے گزارے ہیں اس زمانہ میں بین الکلیاتی سطح پر اردو کا بڑا چھاما جوں تھا۔ کامپی گو ڈی کی بزم ادب، انجمن ہدودیہ، نائل رام بھگوانی داس کانج نظام کانج، ممتاز کانج، چنگل گوٹھہ ہائی اسکول، تقریر متح علی آہار اور عثمانیہ گرو بھوٹیں

اسکریالیشن کی طرف سے تغیری و تحریری مقابلہ ہوا کرتے تھے مجھے یاد ہے آرٹس کالج سے احمد علیس اور نظر سعید، نظام کالج سایا ز، ہمیشہ چند، داؤڈ، زاہد احمد رشید انفاری، وہ میں کالج سے شیخیم کرانی، افری سلطان، اصغری سلطان اور تحریری مقابلوں میں افری محبوب نایاب طور پر حصہ لیتے تھے۔ ہمارے کالج سے میر سے علادہ شریف، احمد قریشی، احتشام الدین اور عبدالعزیز الحابدین کا میا بیاں حاصل کرتے رہے ہیں۔

۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۲ء کا یہ زمانہ وزارہ العلوم کالج کی حیات میں اہم تھے کہ انتقالی کمیٹی کے عہدہ داروں اور علی اکبر صاحب کی صیحہ جمیلہ کے نتیجہ میں ایک مکمل سائنس کالج بھی بن چلا تھا ڈگرنس کورس میں علی اکبر صاحب کی اڑوانس پر بننے سائنس کی بجائے آرٹس کے مضامنے لیئے تھے۔

ادب اور زبان سے صرف ذہنی اور قلبی تعلق نے آگئے چل کر بھل پھول لائے۔ یونین کی سرگرمیوں میں بڑھ جڑھ کر حصہ لینے لگا۔ پیوسی ہی کے زمانہ میں شہید کینٹ میں سکریٹری کے عہدے کے لئے امیدوار تھا اور سوائے احتشام الدین کے ساری کیفیت کو شکست اٹھانی پڑی۔ بی اے میں سینئر طلباء کا مقابلہ، میخ اپنے دامت قلب یار خان کو میدان میں ایسا۔ کامیاب ناکامی میں تبدیل ہوتی۔ یعنی کے لئے پھر مقابلہ ہوا اور قطب یار خان جیت گئے۔ میں نے عکم کا سہارا لیا اور "وزارہ" کا مدیر منتخب ہوا۔ ۱۹۶۲ء کا یہ سال بڑا ہنگامہ پر در ثابت ہوا۔ بی اے کا دوسرا حال تھا ادارت اور یونیورسٹی کی صدارت دونوں پر قبضہ تھا اسی حال وزارہ العلوم کی تاریخ میں ایک شاذ ارشاد مشاہدہ ہوا۔ اس کی تاریخی اہمیت یہ تھی کہ اس میں "اقبال اور حیدر آباد" کے معنف نظر حیدر آبادی جوان دونوں ہمید آباد میں تھے شریک ہوئے اسی سال دھیلا خنزیر کوپی اپیچڑی کی ڈگری بھی ملی تھی۔ مچپوشی کی کمی مشاہدہ کی صدارت مدیر روزنامہ "سیاست" میں جانب عابد علی خان نے فوائی تھی۔ مشاہدہ کو کامیاب بنانا جو سئیش رانے سے کم نہ تھا جو کہ سینئر طلباء ہو ٹک ک اور توڑ پھوڑ پر اُتر ہوئے تھے

اسی شیخ پر چھپلیں چینکنے اور میرے ساتھی کو انزو اگر نے کی بائیں ہو رہی تھیں۔ صورت حال سے میر نے اکبر علی صاحب اور خلیل اللہ حنفی صاحب کے علاوہ فتح الدین صاحب کو مطلع کر دیا تھا سارے اسٹاف مجرز "گریٹ ہال" (موجودہ علی اکبر ہال) میں پھیل گئے شورائھا اور درب گیا مشاہدہ کا میا ب رہا۔ مشمنوں کی آرز و پر خاک اڑی۔ ہما سے حوصلے بلند ہوئے حالات سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت ان دینوں ہی کی دینہ سے اس کامیابی میں میرے دولت رشید بیان کا بھی بڑا دفل ہے۔ جب ہم لی۔ اے فائیں میں پہنچے تو قابل تعظیم بن گئے۔ چھبوٹوں کی دل آزاری ہمیں معقصود نہ تھی ما حول میں گرا گئی رزہی تقریری مقابلہ اب بھی ہوتے تھے اور ہم اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہیں سے اس سال بھی کئی رولنگ ٹرائیں جتیں کامی میں ادبی سرگرمیاں شباب پر تھیں لیکن دل ناتوان تو مقابلہ میں نطف اٹھانے کا خادی کھا اس طرح بُر سکون ما حول میں زندگی بے نطف سی لگی اور اس شریں انسان سب کچھ تو بنا چاہتا ہے قابل تعظیم نہیں چاہتا جو نیز سس نے عزت دے رزندگی چھین لی تھی، اساتذہ کا نورِ نظر بن گیا تھا ناگ راج، اہم راج درما، بھا سکر راج، اگر شنا چاری، آخر حسن، فتح الدین احمد، خلیل اللہ حنفی اور علی اکبر صاحبان ان محضوں میں سے ہیں جنہوں نے قلب ذہن کو نورِ عطا کیا۔ اے آخری دو سال آزمائش اور ابتلاء میں گذرنے علی اور ادبی اعتبار سے یہ شباب کے ذوں کا آغاز تھا لیکن معاشی لحاظ سے سروصلانی تھی دن ہٹکا مون میں گذر جاتا اور رات روکر کاشت، تکیہ بھیگ جاتا۔ حصولِ علم کا جذبہ دامن تھا میں ہوئے تھا ذاتِ اقدس پر لقینِ حکم۔ اساتذہ کے علاوہ اجباب میں بندہ خان، شریف احمد قریشی، قطب پار خان اور بچین کے دوستِ محبوب علی وارثی آڑ سے وقت کام آتے۔ اساتذہ مشغق اور اجباب نہ رہا وہ ملے۔ ۱۹۶۱ء میں بندے کی تکمیل ہے۔ کامی سے بسط ٹوٹا۔ بچپنی بائیں، زندگی اور یادوں کی دنیا کا اثاثہ بن گئی۔ اس سال کے پردوں کو ہٹاتا ہوں تواب بھی دیں چھرے نظر آتے ہیں سیستھے اور مہناستیں لور پری آٹھیں جو بجتت کے نور سے چک رہی ہیں تابناک اور ٹوشن! یہ آٹھیں اور ان آٹھوں کی چمک اب بھی میرے لئے خضر راہ کا کام کریں ہیں۔

النذر شریف

”ایں دُرِّ دکن بونے مدنیہ می آید“

اللہ، پھاڑی حلقة میں گھری ہوئی چھوٹی سی بستی صدیوں پرانی اپنی تاریخ رکھتی ہے کہ اسے پھر کی بڑی بڑی پختہ عمارتیں اور محلی سبھنے چھوٹے چھوٹے گھروں کے یہاں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ نکلیانی کے چانوکیہ راجا و ملک خصوصاً کر مادتیہ کے دور میں ”ایک نہ ارگاؤں کی حکمرانی کا سرچشمہ تھا۔ دکن میں بہمنی سلطنت کے قیام کے بعد اس کی فوجی اور سرحدی اہمیت ختم ہو گئی۔ البته بہت جلد قطب دکن قطب الاقطاب ملک المشائیخ حضرت شیخ محمد بن علاؤ الدین الفشاری قدس سرہ العزیز کی دہلی سے تشریف آئی اور اس کے بعد اس کو نہ ہی درود عالی مرکزیت حاصل ہوئی۔ حضرت دادا پیرؒ کے معتقدوں، مریدوں اور خلفاء کی تعداد یوں تو بہت ہے لیکن ان میں شاہ دکن محمود شاہ بہمنی اور دکیل مطلق حضرت ملک سیف الدین غوریؒ بھی شامل تھے۔ ان دلوں کی عقیدت کے تجھے میں چہاں جا گیریں عطا ہوئیں وہیں بارگاہ کی اتنی خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں کہ جن کو دیکھ کر قرطبہ بھی شرما جائے! حضرت دادا پیرؒ کے وصال کے بعد جو عرس کامیلہ لگتا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے روئی سیاح افانا سمی نے لکھا ہے کہ آنابڑا میلہ ہندوستان بھر میں اس نے نہیں دیکھا۔ شاہان عامل شاہی کے دور میں بھی اللہ تہذیبی اندر سیاحی

۲۵

مذکور تھا اور یہاں افضل خان سپہ سالار بیجا پور کے بھائی فرہاد خان کی چھاؤنی حصی چنانچہ اسی کی بناء کردہ کالی مسجد اور منگ بسیاہ سے تعمیر شدہ اس کی مزار زبانِ حال سے اپنی داستان سنتا تھے ہیں۔ دکن میں آصف جامی سلطانی کا عروج ہولہ میر نظام خان آصف جاہ ثانی نے حاضری دی۔ (۱۷۹۵ھ / ۱۸۷۷ء) ان کے ساتھ امیر پا میگاہ تینج چنگ بہادر تھے وہ میر سے جدّ حضرت سیف الدین الفشاریؒ کو ساتھ جید رہا ہادیے گئے اور دربار سرکار سے سیف نواز چنگ کا خطاب دلایا۔ اللہ شریف اب امراء سے پا میگاہ کے حوالے ہوا اور تعلقہ قرار دیا گیا۔ تعلیمی، ازرعی اور صنعتی افتخار سے کچھ ایسی ترقی نہیں ہوئی کہ جسے قابل ذکر کہا جائے۔ ہاں ! عہدِ عثمانی کی برکتیں ہزار، یہاں ایک مدرسہ و سلطانیہ صرور قائم ہوا، تحصیل و تعلقداری کی عادتیں بنیں، کورٹ بننا اور دو اخانہ بھی۔ کچھ لذت صرور بڑھی مگر ایسی نہیں کر آئیں چند ہیجا جاتیں !۔ اللہ شریف کی تعمیر جدید میں یہاں کے تلعہدار مولوی محمد ابراہیم احمد رضوی نے بڑا حصہ لیا۔ انہیں حضرت دادا پیرؒ سے عیزِ مஹولی عقیدت تھی اور وہ برا درانِ الفشار کی بڑی عزت بھی کرتے تھے چنانچہ ان کے دورِ تعلقداری میں درگاہ شریف میں ترمیم و تعمیر کا کام ہوا۔ اس زمانہ میں الحاج محمد عبد اللہ الفشاری صاحب پیشکار درگاہ تھے جسے انہیں خود بھی درگاہ شریف کو خوبصورت بنانے کی بڑی فکر رہی تھی۔ چنانچہ درگاہ شریف کے انتظامات میں انہوں نے نمایاں کام کیا۔ رضوی صاحب نے درگاہ شریف کے علاوہ محلہ الفشاریان کی مسجد کی تعمیر نو میں دلچسپی بھی لی۔ ابراہیم رضوی صاحب تھے تو دور مطلق الحنائیت کے عہدہ دار۔ لیکن اپنے بادشاہ کی صلح محل کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ وہ ہندو اور مسلمان دلوں ہی کو عزیز رکھتے تھے اور دلوں ہی رضوی حسب

صلحتِ امام وہاں اللہ الفشاری میرے سچتی بڑے ماں ہوتے تھے پاکستان منتقل ہونے کے بعد انہیں حج کی سفرت نقیب ہوئی۔ کراچی میں مارچ ۶۹۸۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔

کو عزیز رکھتے تھے چنانچہ آج کے دور آزادی میں اللہ کی حواس نے ان سے اپنی عقیدت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں روڈ کا نام ان ہی سے منسوب کیا ہے

بلاشبہ عہدِ بہمنیہ میں اللہ شریف کی حیثیت بڑی حد تک پائے تھت نانی کی سی تھی چونکہ محمد شاہ بہمنی اور حضرت ملک سعیف الدین غوریؒ دونوں آپ ہی کے متعدد مرید تھے اس لئے ان کا اکثر دبیشتر اللہ شریف میں قیام رہتا۔ ان دونوں اللہ شریف تہذیبی اور علمی اعتبار سے دکن کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا چنانچہ حضرت نادا پیر خود بھی صاحبِ تصنیف بزرگ تھے آپ کے بھتیجے حضرت قبیر الصاری قدس سرہ العزیز کے فرزندوں میں حضرت بہاؤ الدین الصاریؒ اور حضرت کلمۃ اللہ الصاریؒ عرف میان محمود نے اپنے زہد و تقدیم اور تحریر علمی کے وجہ سے دو بارِ عام اور دو بارِ سرکار میں کافی نام پیدا کیا تھا۔ حضرت قبیر الصاریؒ میرے اجداد سے ہیں۔ حضرت شیخ بہاؤ الدین الصاریؒ بن حضرت شیخ قبیر الصاری قدس سرہ العزیز نے دو بار و سرکار بہمنی کو خیر باد کہا اور راہِ حق میں جد احمد حضرت خواجہ شیخ فخر الدین الصاری خلود آبادیؒ کی تقلید میں تبلیغِ دین کے کام میں نکل گئے۔ حضرت کلمۃ اللہ الصاری المعروف بحضرت میان محمودؒ نے یہیں اللہ و گلبگہ میں تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ چنانچہ میرے پڑاداد حضرت شیخ رشید الدین الصاریؒ کی سختیر کے مطابق وہ فارسی اور عربی کے علاوہ مہندی اور رکنی کے بہت بڑے مصنفوں تھے۔ ایک خاندانی روایت کے مطابق حضرت میان محمودؒ کی یہیں حضرتہ بی بی تارہ بنت حضرت شیخ قبیر الصاریؒ دکنی کی اولین شاعرہ تھیں۔ چنانچہ ۱۷۰۸ء میں حضرت خواجہ دکن سید محمد گیسو درازؒ اللہ شریف لائے اور خانوادہ الصاری کے بزرگوں سے ملاقات فرمائی اور حضرت قطب دکن ملک المشائی زرع کے وصال پر اظہار تعزیت فرمایا تو کہتے ہیں حضرتہ بی بی تارہ زارہ قطعہ رونے لگیں اور دلی کے چھپوٹنے پر جو نظمِ اہم ہوئے کہی تھی آپ کو سنائیں۔ حضرت مولانا شیخ رشید الدین الصاریؒ کی سختیر کی رُشی میں رجس کا ذکر اور اس

کی نقل میری اولین تصنیف "حریر و تنقید" کے علاوہ، قطبِ دکن "میں موجود ہے) یہاں درگاہ شریف میں ہمارے خالواوہ انصار کا بہت ٹپکنہ خانہ لھا جس میں دیگر کتب کے علاوہ حضرت دادا پیر لاکی تھائیف کے ساتھ ساتھ حضرت میاں محمد انصاریؒ کی تھائیف بھی حقیقیں و نیز سعادات بہادرانہ تحریر کرنے والوں کی تھے حادثہ یہ ہوا کہ دشمنان خانہ ان دشمنان علم و نسبت نے مل کر اس کتب خانہ کو آگ لگادی۔ کتابوں کے ساتھ ساتھ ہمارے بزرگ حضرت شیخ کریم الدین انصاری شہید جل کر خاک ہوتے۔ حادثہ بڑا جاہل کا اور حضرت رشید الدین انصاریؒ نے اس کا ذکر بھی بڑے دلخواہ اور دردناک انداز میں کیا ہے کہ پڑھتے ہوئے آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں گوہمنیہ سلاطین کے زوال بلکہ کلب گھر سے پائے تخت کی پیدر کو منتقلی کے بعد شاید بارگاہ کی علی چہل پہل میں فرق ہاگیا مگر روحاںی تقدس جو کل تھا آج بھی ہے اور انشاء اللہ ابد الاباد تک باقی رہے گا تاہم میں اتنی بات ہزدر کھوں گا کہ اس پورے عہد میں میرے اجدار بیشمول حضرت میاں محمد اور حضرت پیر بہاؤ الدین کے حضرت محمد انصاریؒ، حضرت شیخ کریم الدین انصاریؒ، حضرت سیف الدین انصاری جنہیں سرکار نظام نے سیف نواز جنگ اور سیف الملک کے خطاب سے سرفراز کیا تھا، حضرت شیخ رشید الدین انصاریؒ جن کے نام تانی اسم گرامی کی وجہ سے ہماری خاندانی عرفیت پیر خان ہونے کے ساتھ ساتھ رشید ہے۔ حضرت محمد م انصاریؒ میرے دادا حضرت شیخ مسیتے صاحب الفیضی قبلہ نور میرے ولہ حضرت مشاریع انصاری مرحوم رخھور جنہیں شاعری کا چسکہ تھا اور توفیق تملص فرماتے تھے، ان تمام بزرگوں نے اپنی بساط بھر علم، ادب اور تاریخ کی خدمت کی اور حضرت مکالم شایع علاؤ الدین انصاری قدس سرہ العزیز نے اللہ جیسے دور دراز علاقہ میں اپنی خانقاہ بنائی تھی اس کو باقی رکھنے اور آباد کرنے میں اپنی سی کوششیں کی ہیں۔ ان بزرگوں نے ہمیں بکہ ہمارے خاندان کے بزرگوں نے اس مسلم میں اشار و قربانی سے کام یا ہے تب کہیں جا کر وہ اپنے وجود کو باقی دبر قرار رکھ سکے ہیں۔

اس سلسلہ میں حضور بندہ نوازؐ کی بے مثال محبت جہاں ہمارے لئے زاد راہ ہے، اس دنیا کے لئے بھی اور آخرت کے لئے بھی یہیں انہوں نے مشکل حالات میں جس طرح ہمارے خاندانی معاملات میں رچپی لی ہے اور رہنمائی فرمائی ہے اس کے نتیجہ میں بھی بفضل خدا ہم اپنے وجود کو منواسکے پیں چنانچہ اس کے ثبوت میں آپ کا وہ تصریح ہے جو ہمارے لئے دھیمت نامہ کی حیثیت رکھتا ہے جسے آپ نے ۱۵۸۰ء میں تحریر فرمایا تھا ہمارے پاس موجود ہے اس دھیمت نامہ کی روشنی میں ہماری دراثت ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ خاندان رجاہت کا بھی پتہ چلتا ہے اور اس بات کا بھی کہ اولادِ الیوبیؐ اور آل رسول صلعم کا رشتہ کتنا اٹٹ اور مصبوط ہے۔ یہ رشتہ سر زمین پر شرب میں قائم ہوا، خراسان و ہندوستان میں برقرار ہے آج گلگرگہ والند اسی منابع سے اہل دکن کے لئے مثل مکہ و مدینہ ہیں۔

اللہ نہ ہب دیگان کے اعتبار سے چھوڑنا ہماں ہندوستان ہے۔ یہاں خلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں، لذگایت کی کثرت ہے جنی دشیوں کے ماننے والے موجود ہیں۔ برہمن بھی یہیں اور دوسری ذاتوں کے لوگ بھی مسلمانوں کے دو طبقے ہیں انصار و مون! انصار حضرت مولک المشائیؒ کے ہمیجیوں کی اولاد سے ہیں۔ مون کا آبائی پیشہ پارچہ بانی اللہ پارچہ فروشی تھا کنڑی تعلقہ کی اہم زبان ہے اردو زبان مشترک تہذیب کی علامت ہے کنڑی اور اردو کے علاوہ ہندی، امریکی اور گجراتی بولی اور بھی جاتی ہے۔ زراعت پیشہ عام ہے، تجارت بھی ہوتی ہے مگر صنعتی اعتبار سے پس ماندہ ملاقہ ہے تیلی یونان سے بھی ایسا کوئی اہم شہر نہیں ہے۔ ہاں اپنچھپے دنوں یہاں ایک ڈگری کا کجھ ضرور قائم ہو لے گے عام طور پر یہاں کوئی تعلیم حاصل کرنے کی طرف مائل نہیں ہے۔ گجروں کے علاوہ چند ہندوستانیوں ایسے ہیں جو دولت مند کہلاتے باسکتے ہیں وہ دعربت میرے وطن عزیز کا مقدر ہے اللہ میرا وطن ہے، پیارا وطن! عود دگل کے اسی محل میں یہیں نہ کچھیں

کھولی ہیں اور یہیں پہلی سانس بھی لی ہے۔ محلہ انصاریاں کے گھلی کوچے میرے لیئے اور ان مصوّر ہیں کتنی معصوم مشرار تیں اور کتنی انہوںی کہانیاں اللہ کی سر زمین سے دایستہ ہیں جسے یاد نہیں کہ اس ما حولہ کیا کچھ میں نے سیکھا ہے لیکن دو تین باتیں ایسی ہیں جو بوج قلب پر نقش بن گیں۔ مجھے یاد ہے میری ماں جب میں پچھہ تھا اور گود میں تھا چیت سے گھروٹتے سمجھے تھا۔ بارش کے باوجود خود بھیگتی رہیں اور مجھے بینہ سے لگائے اب رو باد سے محفوظ گھر لائی تھیں۔ وہ بارش میں خوب خوب بھیگی تھیں مگر میں محفوظ تھا، ماں کی ممتاز کا یہ نقش اتنا گھرا ہے کہ کبھی میں اسے فراموش نہیں کر سکتا۔

ایک مرتبہ یوں ہوا کہ پانچ جھارڑوں "یہ ہم پچے کھیل رہے تھے۔ بُر سے بُندر آتا نظر آیا۔ ہم پچے بھاگنے لگے مگنا مخیال آیا مجھے ان سب سے الگ نکل بھاگنا چاہئے۔" میں اپنے دوستوں سے الگ دوسرا طرف بھاگنے لگا۔ ثامت جو آتی بُندر میری طرف پیکا میں بھاگتے بھاگتے دم ہو گیا اور بیٹھ گیا۔ بُندر مجھے پھاند کر آگے نکل گیا۔ سبق ملا مجھے سب کے ساتھ رہنا چاہئے ا تھا نہیں! میں آج بھی اپنے دوستوں میں گھر اخود کو محفوظ بھھتا ہوں۔

اللہ شریف کی چیزیت میرے لیئے ہری ہے جو چیز میں ایکی نیچے کے لئے گھوار کی ہوتی ہے ذہنی و قلبی رگاڑ تو حمد ر آباد سے ہے جہاں میں نے کچھ کھو یا تو نہیں ہے لیکن بہت کچھ پایا ہے۔ خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز

اللہ شریف پھیلے کچھ سورسوں سے لفی سالہ ۱۷۶۷ء میں جب دادا بیرون حضرت علام الدین الصاری المعروف بہ لادلے مشائیع دہلی سے دارِ اللہ ہوئے اس وقت سے آج تک نہ ہی اہمیت رکھتے ہے بقول وہاب عہد لیب "آپؒ کی آمد سے اللہ میں بہار آئی۔" اس شہر کا مقدار جائیں آئھا۔ آپؒ کی قدم رنجائی کے باعث یہ شہر تہذیبی و روحانی مرکز بن گیا۔ محمود شاہ ہمینی اور یوسف عادل شامانے اس شہر کو بیغربِ ثانیہ قرار دیا۔

اور نگ زیب کو ہاں مدینہ کی بوآئی۔ چنانچہ وہ ترک پ آٹھا ۷
ایں در دکن بوئے مدینہ می آید

حضرت ابوالغیض بیداری کے الفاظ میں
”دراللند رسید رہ جائے کہ شیخ الحست در آنجا نمازگاہ بود“

ابوالہیم ابن اسماعیل عادل شاہ نے اپنی عقیدت مندی کا انہار شریف میں کیا
یاں دکن میں مولائی عجب شان دیکھت صوں
درگا بندہ لواز کی مکہ تو رو فتنہ مشائیخ کا مدینہ صوں
عہدِ اصلیفیہ میں جب بہادر یار جنگ اللند شریف تشریف لائے اور محلہ الصاریہ
میں داخل ہوتے تو بڑے فخر سے فرمایا تھا ”آج میں مدینہ کی سر زمین پر کھڑا ہوں،
آج کا دن مریازندگی کا سب سے زیادہ خوش نفعیب اور مبارک دن ہے۔“

اصل میں اللند شریف اولیا، اللہ کا روحانی گلداشت ہے، میرے دادا پیر ”
کو بلاشبہ ان میں اریقت د مرکزیت حاصل ہے تاہم گلداشت کی خوبصورتی بڑھانے
میں میرے بعد ابجد، حضرت دادا پیر ” کے بھتیجے حضرت شیخ قبر الصاری ”، حضرت
سہرا ب انصاری ” اور حضرت مبارک انصاری کے علاوہ سادات برادران ”، حضرت
مردان غائب ”، حضرت شاہ علی بابا ” اندر وہ احاطہ درگاہ دریون درگاہ حضرت
عظمت اللہ قادری ”، حضرت مولانا خان ”، حضرت عمر چشتی ”، حضرت شمس دیوان ”
حضرت بنگڑی پیر ” اور دیگر بزرگان دین شامل ہیں۔

اللند شریف جو دکن کی گود میں ایک چھوٹی سی بحث ہے۔ لیکن اس
خاک میں ایسے گوہر آبدار ہنہاں ہیں جن کی وجہ سے اکاڈمیہ تھبتیسے یہ دکنی زبان ”
ادب کا اولین گھوارہ ہے اور مذہبی لفاظ سے پیشہ شان کی حیثیت رکھتا ہے القبال کے
الفاظ میں ہے چشم مسدیکر دیں ہے اسی خاک سے روشن پاڑیے خاک کے ہیجس کا خرق ریکروڑ رناب ”

گلزارِ گہرے

”ہندوستانی تہذیب کا اولین گھوارہ“

گلزارِ گہرے تاریخِ ہند میں اپنی عظمت، اجاه و حشمت اور تہذیبی وجاہت کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ یوں تو محمد بن قاسم کے حملے کے بعد ہی ہندوستان میں مسلم سیاست دخیل ہو گئی تھی لیکن سلطان محمود غزنوی (۱۰۴۰ء) اور محمد غوری (۱۱۸۷ء) کی فتوحات نے مسلمانوں کے قدموں کو استحکام بخشتا۔ چنانچہ محمد غوری کے ایک نظام اور سپہ سالار محمد قطب الدین ایک نے ۱۱۹۶ء میں اپنے پانے سخت کو صوبہ پنجاب و سندھ سے ہٹا کر دہلی منتقل کیا اور ۱۲۰۶ء میں اپنی خود منواری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح سے دہلی تیرہوں صدی ابھری میں مسلم سیاست، مسلم تہذیب اور مسلم عقائد کا مرکز بن گئی لیکن محمد بن تغلق کے دیوگری کو پائے سخت کی منتقلی (۱۳۲۶ء) کے بعد تک بھی مسلمان حکمرانوں کو ملک میں استحکام حاصل نہ ہو سکا اور دہلی ہمیشہ انتشار کا شکار رہی ہے۔ ظاہر ہے میں ایسے دور میں کسی تہذیب کے پروان چڑھنے کا کوئی نقصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔

دکن میں ایمانِ صد میں محمد بن تغلق کے خلاف جب علم بخارت بلند کیا اور اسکیل رخ کے بعد علاء الدین حسن نے ۱۳۳۶ء میں اپنی مطلق الخواصیت کا اعلان کیا تو ایک نئی سلطنت بسا۔ سیاست پر ابھری اور دیوگری کی بجائے گلزارِ مسلمانوں کے سلسلہ میں اور نئے سیاسی و تہذیبی ہر کمز کی حیثیت اختیار کر گیا۔

گلبرگر کے ضمیم کے بارے میں تاریخ میں بہت سے داقعات محفوظ ہیں۔ کہا جاتے ہے کہ کلی چند یہاں کا ایک اہم راجہ گذر لہے البتہ ۷۳۰ھ کے بعد جو علاء الدین حسن نے اس کو اپنی پاکتے تخت بنایا تو اس کی مبسوط تاریخ ہمارے سامنے آئی اور گلبرگر نہ صرف بہمنیوں کا ایک اہم سیاسی مرکز بن گیا بلکہ تہذیبی، سانی اور مدنی اعتبار سے بھی اس کی اہمیت بڑھ گئی، اور اس کو ہندستان کے دوسرے سیاسی مرکز میں فوقيت حاصل ہوئی۔

دل کے برخلاف گلبرگر میں سیاسی استحکام زیادہ حاصل تھا اسی وجہ سے یہاں امن و امان قائم رہا اور تہذیبی اقدار کو پروان چڑھنے میں ہمولت اور سماں حاصل ہوئی۔ اس سلسلہ میں، ہمینی سلطنت کے بیدار سخز اذہن اور فابل و کیل سلطنت ملک محمد سیف الدین غوری کا تدبیر کام کر گیا۔ ملک محمد سیف الدین غوری اُدنیا کے چند دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں اور وہ ایسے سیاست دان گذرے ہیں جن کی شاہی تاریخ عالم میں شاید ہی ملتی ہو۔ ملک سیف الدین غوری دیگر بادشاہوں اور وزراء سے مختلف تھے اور وہ حدود سلطنت کی تو سیعی کبھی قائل نہیں تھے چنانچہ انہوں نے قیام سلطنت کے بعد علاء الدین حسن کو مزید جنگ و جدال سے روکا اور اندر وہ ملک استحکام حملکت پر زور دیا اور وہی انگرم کے راجہ سے صالحی روپی اختیار کیا۔ غوری کا یہ طریق کارہند کے دیگر مسلمان بادشاہوں کی حکمت عملی کے سراہ مختلف تھا۔ قطب الدین ایوب سے یہ کہ محمد بن خلق تک تمام بادشاہوں نے ہوس ملک گیری میں ملک کے امن کو برباد کیا جبکہ دکن میں علاء الدین حسن نے امن و امان کے قیام پر زور دیا۔ ظاہر ہے پر امن دوسری میں لای تہذیبیں پروان چڑھتی ہیں۔ ملک سیف الدین غوری کا دوسری اہم کارناہ یہ ہے کہ انہوں نے ملا طین ہمینہ کو اس بات پر راغب کیا کہ اندر وہ ملک ہندوسلم اتحاد پر زور دیں۔ چنانچہ تاریخ ہند میں سب سے پہلے ہندوسلم کا پھر کی بنیاد پڑی۔ علاء الدین حسن نے اس اندرا ذکر کو عملی صورت دیتے ہوئے مال کا صیغہ براہمیوں کے پروردگار اور دکن ہمیڈیوں کی ایک بڑی تعلیم کا بلو ہوئی چنانچہ قلعہ کے پہنچ شہاب ہمینی پروردگاریستی آباد ہوئی جس میں لمح

بھی برائیں بستے ہیں۔ اس طرح مذہبی رداری کی ایک نئی فضار پیدا ہوئی۔ مشہور میر غیاث میر محمودی نے لکھا ہے کہ "اس طرح ہم ایک مستدرپکار ڈر کھتے ہیں کہ ہمیں سلاطین کی مذہبی پالیسی کی بنیاد باہمی اتحاد Toleration پر کھی گئی تھی انہوں نے مستقبل کی نئی نسل کرنے ایک درست چھوڑ اتحا جو درج ذیل نکات پر مبنی ہے۔

۱) ہندو مسلم استخار

۲) آرٹ ارت تعییم سے محبت اور یہ روحاںی درستہ

ہمیں سلاطین کے ان کا ناموں کے سچے غوری کا نہیں برابر کام کرتا رہا۔ چنانچہ یہ ساری تعلیمات ان کے دستور سیاست "نصاری الملک" سے اخذ ہیں یہ صحیح ہے کہ گلبرگہ اب ایک تہذیبی محرکی صورت اختیار کر گیا تھا تاہم حسن کو اتنا وقت نہیں ملا تھا کہ وہ گلبرگہ کو تہذیب و تمدن کا سرچشمہ بنارتیتا تاہم اس کے جانشین محمد شاہ ادل نے اس سلسلہ میں کافی پیش رفت کی اور اس کے دور میں گلبرگہ علم رابر کا گھوارہ بن گیا۔ چنانچہ میراحمد علی خان کے مطابق اس کے دربار سے مولانا زین الدین دولست آبادی "حضرت محمد سراج الدین جنیدی" حضرت معین الدین بیجا بورجی، صدر شریف سمرقندی، نظام الدین بزن، حکیم ظہیر الدین تبریزی، صفتی نظام الدین اسید بھنی سندھی لغوث الدین سمنانی اور مولانا بہار الدین الفردی الغدی ایسے جیگہ علماء و حموفیار وابستہ تھے۔

محمد شاہ اول کے بعد گلبرگہ سیاسی انتشار کا شکار ہوا چنانچہ ایک کے بعد دیگرے بارشاہ یا تو قتل کر دیئے گئے یا اندھے بنا کر قید کر دیئے گئے مگر محمود شاہ ہمیں کے زمانہ میں گلبرگہ تہذیبی اعتبار سے اپنے نٹاہ اثاثیہ کو پہنچ گیا۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ بادشاہ محمود شاہ ہمیں اور دیگلیںسلطنت غوری دونوں ہم خیال، ہم مشرب اور ہم پیالہ تھے دونوں ہی امن پسند اور مذہبی آدمی تھے اور دونوں ہی حضرت شیخ مخدوم علام الدین انصاری کے مرید تھے چنانچہ ایک تعلیمات سے دونوں ہی نے فیض حاصل کیا اور اندر دین ملک بھائی چلادہ

اور یگانگت کی ایک فضای بیانی۔ عصانی نے ہمین نامہ میں لکھا ہے
جو ان مشہد بدولت سماں بر گرفت۔ پہ شاھنشہ چہتر بر سر گرفت
بیسے سالہ اور جھاں کام یافت۔ وہ تختہ بے رزم آرام یافت
 بغیر کسی خون خرا بہ کے محمود شاہ نے برسہا برسی حکومت کی اور اس دوران گلبرگہ کو
رشک بندار بنادیا۔ علی بن عزیز اللہ نے لکھا ہے محمود شاہ ہمینی کے بارے میں:
بہ زیور عقل د دانش آرائستہ
دکن کے مشہور مورخ فرشتہ نے لکھا ہے۔

”محمود شاہ کا مطابعہ دیکھ تھا، وہ علوم کے مختلف شعبہ جات میں درک رکھتا
تھا وہ عربی اور فارسی میں بکسان ہجور رکھتا تھا وہ قرآن حکیم کو صحیح تلفظ کے ساتھ
پڑھ سکتا تھا۔“

فرشتہ نے محمود شاہ کے کردار اور اخلاق کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سلیم النفس
کم آزار، خوش فعلن اور عدالت شوار تھا۔ اسی کے زمانے میں ایران کے حافظ شیرازی
کو مدد عوکیا گیا تھا۔

محمود شاہ ہمینی کے زمانہ میں تعلیم کو بچھا چکے گلبرگہ کے علاوہ
بیدر، قندھار، بلخ پور، دولت آباد، چاولی اور دویل میں درسی گاہیں کھوئی گئیں یعنی
اور اندر میں حضرت ملک المشائیخ کی خانقاہ علوم دینیہ کا زبردست مرکز بن گئی تھی۔

فیروز شاہ ہمینی کے دور میں گلبرگہ تہذیبی اور سیاسی اختبار سے مزید مسلح
ہوا اور یہاں ایک نئی اور مشترکہ تہذیب اپنی ممکن صورت گردی کے ساتھ ظاہر ہو گئی
فیروز شاہ کئی ایک زبانوں کا جانے والا بادشاہ تھا اس کے محل میں مختلف زبانوں کی
جانے والی بیکیات شامل تھیں جن سے وہ اسی کی زبانی میں بات کرتا تھا اس وقت بھی
گوفارسی زبان سرکاری چیزیں رکھتی تھیں تاہم مرہٹی اور کنڑی کو علاقاً تھیں چیزیں شامل

تھی اور ان زبانوں کی ترقی کے پورے موافق حاصل تھے ابتداؤ حسن اور بعد محمد شاہ بھینی نے جس ہندلہانی کلپر کی داعی بیل ڈالی تھی اس تہذیب کو پہنچنے اور پرداں پڑھنے کے پورے موافق اس کے درمیں حاصل تھے۔ مگر گرگہ ابتداء ہی سے صوفیاً اور سنتوں کا مرکز تھا پھر اپنے حضرت جیندیٰ، حضرت مہماج الدین الفاری تمبھی، حضرت تیخ برہنہ، حضرت احمد کبیر، حضرت مولانا قادر، مولانا احمد دبیر، حضرت پہاودین، نگوٹ بنداد رحافت رکن الدین قولہ، ایسے مسلم صوفیاً اور شرمن بسپا آیا الیہ ہند و صوفی صفت یہاں موجود تھے فرید ز شاہ کے زمانہ میں حضرت خواجہ دکن بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہ العزیز کی آمد نے مکابرگہ کی روحانی، مذہبی اور تہذیبی رونق کو دو چند کیا۔ آپ اور آپ کے خانزادوں کے بزرگوں نے مذہبی تعلیمات کے ذریعہ مکابرگہ کو ہندوستان بھر میں قابلِ رشک بنادیا۔ آپ فارسی، عربی اور دکنی کے ملادہ سنسکرت اور ہندی کے ماہر تھے۔ آپ کے فرزند اکبر حضرت شاہ اکبر حسنه، بھی صاحبِ تصنیف بزرگ گزار سے ہیں ایک طرف تو فرید ز نے علم اور فلسفہ کا دبستان کھول رکھا تھا تو رسی طرف حضرت بندہ نواز نے علم دین اور تصوف کے ذریعہ علمی حبل پہل پیدا کر دی تھی گو فرید ز شاہ اپنی اخلاقی پداعت دیوبون کی وجہ سے معنوں اور بھر محروم ہوا تاہم ان کی لسانی اور علمی ہمہ دانی مسلمہ حیثیت رکھتی ہے اور یہی وہ دوسرے جیکے مکابرگہ تہذیبی اور لسانی لحاظ سے ہندلہانی تہذیب کا اہم مرکز بن گیا۔ بقول عہد القادر سروری:

”واقعہ یہ ہے کہ دکن میں جو بین قومی اتحاد اور باہمی رواداری ایک طویل زمانہ کی فتنہ سامانیوں اور انقلاب کے باوجود اب تک نمایاں ہے وہ پہیجنی حکمت عملی ہی سے پیدا ہوا تھا اس خاندان نے ۱۵۲۵ء سے تک اس نک کی تہذیب و معاشرت اور ادب و سیاست کی رہنمائی کی اور اپنے بعد ایسی مستقل یادگاریں چھوڑ لیا جو اس کے نام اور کام کو یاد دلاتی رہیں گے۔“

برخلاف اس کے جمل جابی نے اپنی تاریخ تاریخ ادب، اندود (جلد اول) میں اپنے اس معرفت

کے ساتھ بکھا ہے کہ

” اس نئی سلطنت (بیمنی) کی بنیاد میں شمال دشمنی کے جدبات شامل تھے
شمال دشمنی کے جوش میں انہوں نے سماں لائے عمل کے طور پر ان تمام عنابر
کو آبھارا جو شمال سے مختلف اور خصوصیت کے ساتھ سر زمین دکن سے
تعلق رکھتے تھے۔ ایک موڑ لفیا تی حربلے کے طور پر بیمنیوں نے دل کھول
کر مقامی روایات کی حوصلہ افزائی کی۔ دیہی رسوم درواج، میلوں
ٹھیلوں اور ہواروں کو ترتی دی۔ باہمی ربط فیض، میل جوں اور
معاشرت و تہذیب کو گھبرا کر نہ کرنے اس زبان کی سر پرستی کی جو
رنگارنگ زبانوں کی اس سر زمین میں بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے
رائج تھی اور جسے ہم آج آر د کے نام سے موسوم کرتے ہیں ” (ص ۱۲۹)

جمیل جاہی کے اس خیال سمجھے سخت اختلاف ہے کہ دکن میں جو کتنی روایات کو
فرورغ حاصل ہوا وہ شمال دشمنی کا نتیجہ تھا۔ حالانکہ دکن کا بادشاہ شمال ہی سے دکن آیا تھا
امیر صدہ کھلا یا تھا۔ البسطہ یہ صحیح ہے کہ بیمنی سلاطین نے ایک سوچے سمجھے منصوبہ اور
ایک سیاسی بصیرت کے تحت دکنی زبان، دکنی ادب اور دکنی تہذیب کو نیارنگ و آہنگ دیا
اور اسکے پل کر دکنی تہذیب کا یہ کینوس پھیل کر شمال کو اپنے رنگ میں رنگ لتا چھوڑ دیا۔
چنانچہ بیمنی سلاطین کے بعد جس طرح عادل شاہی اور قطب شاہی بادشاہوں نے ہندستان کا پھر
کو اپنی سیاسی بصیرت کے بل بوس تبر قبول کر لیا تھا اسکے طرح جلال الدین اکبر نے مظیہ عہد میں
ایک نئی تبدیلی کا ثاخدا نہ صدر ثابت ہوئی لیکن سماجی، مذہبی اور ادبی اعتبار سے بیمنی کا پھر
دست گرفتہ رہی ہیں۔

گلبرگہ میں بیمنی سلاطین نے دکنی زبان و ادب کے سپاہارے جس مشترکہ تمدن کی
دائیں دلائل اس تعلق سے ایک بات صدر ذہن میں پیدا ہوتی ہے کہ آیا یہ سلطنت

کے لئے ایک مصلحت اور حکمت تھی یا پھر یہاں مجت، صلح، آشی اور بھائی چارگی کے
جذبات و احساسات بھی کافر فرماتھے۔ جیسا کہ میں نے ابتداء میں بتا یا ہے، ہمینی سلطنت
کی بنیادوں کو مفہومی طبقہ بنانے اور یہاں کی تہذیب و تمدن کو سنبھالنے کے خواص نے میں یہاں کے
پہلے و کامل اسلطنت مک میف الدین عزوری نے گلی اور کلیدی حصہ ادا کیا ہے وہ بلاشبہ ایک
جیسا سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ فریضی سماں داں بھی تھے اور اس سے روکھ کریا کہ
وہ ایک مذہبی آدمی تھے۔ انہوں نے نصائح الملاوک کے نام سے جو دستور عمل تدوین کیا تھا
وہ ان کی مذہبی بصیرت کا نتیجہ تھا۔ اسلامی تعلیمات ہمیشہ ہی سے انسان کے پشت پناہ رہے
ہیں ان ہی تعلیمات کی روشنی میں عزوری نے ہمینی حکمت عملی کی بنیاد خدا تری اور انسان دوستی پر
روکھی تھی۔

پس تو یہ ہے کہ مستقبل میں یہی اقدار ایک عالمی معاشرہ کی تشکیل کا سبب بنتی گی

پڑھ کر پڑھ

میسور

خوابوں اور خواب زاروں کا شہر

میسور چیز خوابوں اور خواب زاروں کا شہر کہا جاتا ہے اس شہر کو قدرت نے انی چلوہ سماں کے ذریعہ وہ حسن عطا کیا ہے جو دلوں کو مودہ لیتا اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے بہاں کے تالاب، بہاں کے سبزہ زار، بہاں کے گلشن اور بہاں کی آب و ہوانے اس شہر کو فردوسی نظر بنا دیا ہے خصوصاً برنداؤن گارڈن شہر میسور ہی کا نہیں پورے ہندستان کے ہنگات کا سرتاج ہے بلاشبہ سرینگر (شمیر) کے محل گارڈنس اپنی خصوصیتی اور شادابی کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں تاہم برنداؤن گارڈن کی شان ہی جداگانہ ہے خصوصاً سر شام جب برقی قمقھے جگمگا اٹھتے ہیں تو گلماہے کہکشاں ٹوٹ کر زمین پر آریجی ہے۔ واقعی ریاست میسور کے ذریعہ اعظم سرزا اسماعیل اور بہاں کے دڈپار راجھوں نے مل کر اس شہر کو بہت رنگیں اور حسین بنادیا ہے اس کی کشادہ سڑکیں، چوراہوں پر بنے راجوں کے خیسے ابرقی قمقھے، چمن بندی، آراستہ بازار، راجہ کا محل تودہ شہر کے موقع پر بقعہ نور بن جاتا ہے میسور کا دشہر حیدر آباد اور بکھتو کے حرم کی طرح مشہور زانہ ہے۔ لدت محل، میوزیم، نند کی ہلز اور ایسکیعہ مقامات یہیں جو میسور کو قابل دید بنا دیتے ہیں میسور دکن یہیں ہندو خصوصاً

کنٹرا تہذیب کا ایک اہم مرکز ہے یہاں کے ٹھرانوں کی فرماندی اور دینی النظری نے اس شہر کو بہشتِ ارمی میں تبدیل کر دیا۔ میسور اسلامی نقطہ نظر سے بھی ایک اہم شہر ہے۔ حیدر علی اور ٹپو سلطان شہید کا دورگو بہت مختصر تھا لیکن ان بادشاہوں کی رعایا پروری انسان دوستی اور اسلامی اقدار سے الفت نے میسور اور اس سے قریب واقع شہر سرنگا پشم کو اسلامی تہذیب کا جیتا جا گئا نمونہ پنادیا۔ میسور علم رارب اور شعر کا سرچشمہ ہے یہاں نافی گرامی شعر اور ادب اور پیدا ہوئے حیدر علی اور ٹپو سلطان کے دور حکومت میں علماء و فضلہ کی بڑی تعداد یہاں جمع تھی زبانِ فارسی کے ساتھ ساتھ زبانِ آردو کو ترقی حاصل ہوئی اور یہ کہ تاریخِ جنگ آزادی میں سرنگا پشم اور میسور محااذ جنگ بن گئے تھے۔ ٹپو سلطان کی شہادت نے اس شہر کو تاریخِ ہند میں دعام بخشتا۔ چنانچہ شہرِ آفاق شاعرِ اقبال نے جب یہاں مزار ٹپو سر حاضر ہی دی تو کچھ دیس کے لئے وہ کھوسے گئے تھے۔ ان کا خراج آج بھی اقبال کی شاعری کا گراں قدر حصہ ہے پس تو یہ ہے کہ جس طرح آخری محل تا جدار پھارشاہ طفرے نے افواجِ ہند کی سالاری کی تھی اسی طرح ٹپو سلطان نے بھی فرنگیوں کو ملک پدر کرنے کی لہانی تھی۔ ایک ولولہ، ایک جوش تھا جو ٹپو سلطان کے سینہ میں ہوجزن تھا رہ بھی اور اس کے سپاہ بھی انگریزوں کو ملک سے نکال ہاہر کرنے کا عزم معمم کر چکے تھے چنانچہ فوجی پہمیدہ کے موقع پر جو نفعے گائے ہے جاتے تھے آج بھی ان کی صدائے بازگشتِ حیدر و ٹپو کی گبندیں سنی جاسکتی ہے۔

ملک ہندوستان میں دین کا دیوبی سلطان ہے
غرق جس کے آبِ خیر میں فریضتانا ہے
کیا ہے نسبت جاہ و حشمت میں سکندر سے سچے
بارگاہ و قدر کا دارا تر ا دربان ہے

دعا کرتا ہے ہر ایک مور جس وادی میں تو گز لے
 فلک پر چڑھتے ہے جب تک از میں پر ٹپو سلطان ہے
 جنگ آزادی میں تا چہارالہا میسور نے جو حصہ ادا کیا ہے اس کے ذکر کے بغیر
 تاریخ ہند کے صفحات سادہ اور سفید مجھے جائیں گے۔

آردو زبان و ادب کے فروع میں میسور اور اہل میسور کا ناقابل فراموش حصہ رہا ہے
 یہاں گھار بھوی صدی ہجری ہی سے آردو ادب کا سراغ ہوا ہے چنانچہ سقوط بیجا پور کے
 بعد اہل علم و کمال، ہجرت کر کے یہاں میسور میں جمع ہوئے اور حضرت امین الدین علی اعلیٰ کے
 بیشتر مریدین و خلفاء نے میسور اور اس کے اطراف و اکناف کے علاقوں میں بود و باش اختیار
 کی۔ ڈاکٹر جیب النساء نے ریاست میسور میں آردو ادب کی نشوونامیں آردو زبان و ادب
 کی تحریکات کا جامع اور محقق آردو سلیم تہذیب نے اپنے چیدہ چیدہ سفرا میں میں ان کا ذکر
 کیا ہے شاہ صدر الدین پر ڈاکٹر ہاشم علی کی تحقیق ایک اہم کارنامہ ہے اس طرح گیارہویں اور
 بارہویں صدی ہجری کے بعد سے آج تک آردو کے کئی نامور ادیب اور شاعر یہاں پیدا ہوئے
 ہیں عہدِ حیدر و ٹپو: کے بعد و ڈیر غاذان کے خاتمہ حکومت میں بھی اور آزادی کے بعد شاعر
 اور ادیب کا ایک تقابلہ ہے کہ رواں دوالہ ہے!

عہدِ حیدر کے شاعر اور ادیب کی چہرست بڑی طویل ہے یہاں کی بزم آردو اور اجمن
 ترقی آردو ہند فعال ادارے ہے میں۔ بزم آردو کی بزم آرائیاں اقبال درید اور رزا ق آفسر
 کی ذات سے عبارت ہیں۔ خلیل ہے باگ گو صحافی ہیں مگر شعر بھی موزوں کرتے ہیں اور
 تنظیمی کاموں سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کا روزنامہ "کوثر" میسور کا محترماً خبار ہے ان کے دم خم
 سے میسور میں اکثر مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں، ہامدہ میسور اور میسور میں مختلف کالجوں کے
 کے قیام کے بعد تو یہاں آردو کا چین سدا بہار ہو گیا ہے چنانچہ اساتذہ آردو میں پروفیسر

خفر علی خان، پروفیسر عبدالقدوس سروری، ڈاکٹر طجیب النساء، پروفیسر حنفی کلیم، پروفیسر سراج الحسن آدیبی، پروفیسر میر محمود حسین، پروفیسر عباد القادر، پروفیسر مبارز الدین رفت، پروفیسر ڈاکٹر ماشیم، ڈاکٹر قیوم صاقن، ڈاکٹر مسعود سراج، محترمہ محمودہ فناہم شبلیم، پروفیسر عبدالرشید، محترمہ تھانیہ نیلوفر، ڈاکٹر جہاں آزاد، ڈاکٹر جمیلہ بانو، ڈاکٹر برجیس فاطمہ اور مہ جبیں صاحبہ ہنگم کے علاوہ ممتاز زرینہ اور شہزاد تیوم نے باعثِ اردو کی آب یاری کی ہے۔ خصوصاً نوجوان اساتذہ میں سید منظور احمد ایک فعال اور مختصر شاعر ہے جس کی ترقی اردو وہند میسور کے مختار ارجمن اساتذہ اردو جامعات پہنچ کے رہیا۔ سلیمانی کے لئے کتو نیز ہیں۔

سلیمانی میسور کی ان ہمیتوں میں شامل ہوتے ہیں جن کے نازک کندھوں پر اردو کا گراں بار بوجھ لادیا گیا ہے یہ رقف بولے اردو ہیں۔

سلیمانی کی دیسی تواریخ دو ربان سب سے بڑی کمزوری ہے لیکن ان کی دوسری کمزوریوں میں شہر میسور اور سلطان پیپو بھی شامل ہیں۔ یہ عاشقِ میسور ہونے کے علاوہ عاشقِ پیپو سلطان بھی ہیں۔ ان کی دوسری اور بہت سی کمزوریاں ہیں میں ان کا ذکر بیہاں نہیں کروں گا کہ میں ان کا دوست ہوں اس لئے یہ کہہ کر مٹاں جاتا ہوں کہ آخ سلیمانی بھی تو انسان ہیں اور کمزوریاں بشریت کا تقاضہ ہیں! "ہمہ خاندان آفتاب است" کے مصدق یہ اور ان کا پورا خاندان اردو زبان کا شیدائی اور خدمت گزار ہے۔ ان کے چھٹے بھائی نعیم اقبال خود بھی اچھے انداز نگار ہیں ان کی رشتہ کی بہن رفت زہرہ اچھی ادیبہ ہیں اور تو اور ان کی نصف بہتر (ملیں ان کو سلیمانی کی کمزوری نہیں کہوں گا) مجیدہ سلیمان بھی اپنے ذوقِ سلیمان کے لئے مشہور ہیں حد تو یہ کہ ان کی نمبر ۲ دختر نیک اختر عذر را بھی اردو زبان کی خدمت کرتے ہوئے خوش ہوتی ہیں۔ سلیمانی کے الفاظ ہیں۔

” پیدائی بیٹی عذر لَا کا ایک پیارہ احسان کی قائل نہیں) اس طرح احسان بن گیا کہ کنڑی پر اُرد اشتر مفہوم کے لئے کنڑی ادب سے بھی اُردو الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے ۔“ ۱۷

شاید بھی پاپ کے نقش قدم پر چل رہی ہے کیونکہ سلیم تمہانی بنیادی طور پر ہندی ادب کے طالب علم ہیں مگر خدمت کر رہے ہیں اُردو زبان و ادب کی ۔ اسی طرح عذر را اُردو زبان نے ہوئے بھی اُردو زبان کی خدمت کر رہی ہیں ۔ لگتا ہے عذر را پاپ پر گئی ہیں !

سلیم تمہانی اُردو کے انشاہ پرداز بھی ہیں تحقیق بھی اور اس سے بھی بڑھ کر وہ المدد زبان کے یہ نقیب، اُردو تہذیب کے نگہداں بھی ہیں ۔ ان کو اُردو زبان اور اُردو والوں سے ہے پناہ محبت ہے ۔ ان کو اپنا غلوص سچھا درکار نہ کرنے کے لئے کافی ہے کہ آپ اُردو زبان کے ادیب و مشاعر ہیں ۔ اپنی انشاہ پرداز کی اور تحقیق کی وجہ سے جہاں یہ تکمیل ہے جانے پہنچاتے ہیں، وہیں اُردو نوازی کے داسطھ سے ہمان نوازی کے لئے در در کے اسکالرز، ادیب اور تحقیق ان کی صفات سے محظوظ ہوتے ہیں ۔ مالی وسائل محدود ہیں لیکن اللہ نے ان کو دل بڑا دیا ہے اور اس دل میں درد بھی بڑا ہے اس نے اپنے احباب کے لئے بچھ سے جاتے ہیں اپنے نازک کندھے پر کپڑے کی تھیلی لٹکائے یہ شہر بھر گھوٹتے پھرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اُردو کہاں کہاں کمپسری کی حالت ہیں ہے اور کہیں نظر آ جاتی ہے تو فوری مزاج پرسی کرنے لگتے ہیں عزیز سینٹھ صاحب (سابق وزیر ریاست کرناٹک) ایم پی سے ان کے مخلصانہ مراسم بھی حضرت اسد پیر اہل اشاعت میوری، نذیر احمد، نذیر محمد، خلیل عباد

رزاق افسر اور جانے کوں کسے ان کے اپنے بھر سے روایتیں ۔ بہر حال یہ سب کے آشنا اور سب ان کے شناسائی ہیں ! ان دنوں یہ اجمن ترقی اردو ہند (میور) کے ہدر میں حالانکہ ان کو کسی اجمن کی ضرورت نہیں، یہ اپنی ذات سے ایک اجمن ہیں محاورہ نہیں واقع تا اور جب سے اجمن کے ہدر میوگئے ہیں گھر کی کم اور اجمن کی زیارت فکر کرنے لگے ہیں۔ دیسے بھی ان کو گھر سے کم ہی سروکار رہتا ہے وہ تو غنیمت ہے کہ سماجی مجیہ پڑھی لکھی اور ملازم ہونے کے باوجود گرہت خاتون ہیں۔ ان کے سلیقہ نے ان کی رٹکیوں میں اور عندا کو بھی سلیقہ مند بنادیا ہے۔ ہونہار برواء کے چکنے چکنے پات، حسی چھوٹی رٹکی بھی بال و پر لائے گی اور خاندان کی ناک اوپنی رکھے گی۔ شاید اپنی بیوی صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کی اسی ہوشمندی نے سلیم تمنائی کو گھر کی ذمہ داریوں سے بے نیاز رکھا ہے۔ مگر ایک بات یہ اپنے متعلقین کو رکھا ہیں وہ بیوی یا بیوی یا بھائی بھائی بھت کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں۔ بھلا بتائیے وہ شخص جو ہم ایسے عزیزوں کو اپنے حسن سلوک اور محبت سے گردیدہ بنالیتیلہ سے اور بے مکان خلوص کی دولت پنچاوار کرتا ہے وہ اپنوں کو کیسے محروم کر سکتے ہے۔ دیسے بھی سلیم تمنائی پیدا اکثر ملحوظ پر شرطی زادہ ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت عبد القادر جیلانیؒ سے ملتا ہے اور ان کے بعد حضرت دودھ پیرؒ نے علاقہ میسور میں تبلیغ دین کے فرائض کو انعام دیا ہے اولیا ہے میسور میں ان کا بڑا امر تجھے ہے اور عید گاہ قدیم میں ان کا "مکان" زیارت گاہ خاص دعام ہے سلیم تمنائی اپنے مخصوص طرزِ تحریر کے لئے بھی اردو ادبیوں میں امتیاز اور افراطیت رکھتے ہیں۔ اہنونے نذیر احمد سے متعلق مصنایف کو بیکھا کیا ہے۔ ایک ہستی، ایک اجمن، ان کی دوسری اہم تصنیف دانائی سے راز دیا رکنؒ میں اقبال کی میسور و بھلولر بھی آمد اور روح نہ پر والہی سے متعلق ہے قومی تجھی اور دکن دیں ان کے متفرق مصنایف

کا مجبو عہد ہے سلیم تھنائی بیانیاری طور پر ایک محقق ہیں اور مجھے ان کی اس تعینیت کا انتہا رہے جو اردو ادب کے ذخیرہ میں یقیناً نایاب و کمیاب کہلاتے گے۔ ایسی توقع بے جا بھی ہنسیں اس لئے کہ سلیم تھنائی کی ذاتی لا بُریری میں ایسے نایاب اور کمیاب مخطوطے ہیں جن سے وہ استفادہ کر سکتے ہیں۔

میرا یہ احساس ہے کہ سلیم تھنائی تنظیمی امور میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں خصوصاً جب سے وہ اجمن کے صدر بن گئے ہیں وہ پریشان، پریشان گھومتے، لوگوں سے ملتے، شعلوں ادبوں کو اکٹھے کرتے رہتے ہیں یہ ہیں دبليے پتکے سے، ناک پکڑو تو تم نکل جائے مگر ان کا رگزاریوں سے شہر بھر کے لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ سونے پر سہاگہ ان کی دستی مسید منظور احمد سے جو ہو گئی ہے تو سارے شہر میں اجمن کا ہنگامہ ہے، منظور بڑے ذمہ دار آدمی ہیں۔ بات اور وقت کے پابند اور تنظیمی صلاحیت بلاکی ہے جذبات پر قابو ہو تو یہ بڑے کام کے آدمی ہیں۔ سلیم تھنائی اور منظور احمد کا میخوگ میسور میں اردو کے ماحدوں کو بذاۓ سے رکھتے اور پروان چڑھانے میں مدد و مدد دگار ثابت ہوا ہے۔

چشم بددور —!

پتہ نہیں خوابوں اور خواب زاروں کے اس شہر میسور میں ایسی کتنی شخصیتیں ہیں جن کی ذات اردو ادب اور اردو تہذیب کے لئے باعث ہا برکت ہو گی اور جن کا ہو لالہ کی حسابندگی میں فاموشی کے ساتھ مصروف ہے۔ تاہم میں جن شخصیات سے واقف ہوں اور جو کے کام نے مجھے تماشہ کیا ہے ان کا ذکر میں نے پہاں کر دیا ہے۔ دیسے بھی گلشن کی رعنی صرف گل و گلاب ہی نہیں ہوتے وہ سبزہ بھی ہوتا ہے جو زمین پر پھک کر جمل قدی کرنے والوں کو تازگی اور تراوٹ بخاستا ہے۔ میسور اکی بعنوان میں سبزہ زار بھی ہے، صداہ براہما۔

میمور کے ادیب، میمور کے شاعر، میمور کے فنکار اور مصور ہی سب اس گلشنِ اُرد کے گل دھلاب ہیں، چیا! چیلی، موگھرا اور مو تیا بھی! ان ہی کے قلب و نظر کی تازگی اور تراویث نے اُرد کے اس بربادون گارڈن کو حُسنِ بھی اور روشنی عطا کی ہے اور یقین ہے ان ہی کے خوبیوں سے اس گلشن کو حیاتِ نو ملتی رہے گی!

* نام بہ نام :-

فہمیدہ النصاری

مقام اپنی خودی کا.....

حیات کا تصور ہر ان اپنی استطاعت، قابلیت اور صلاحیت کے مطابق رکھتا ہے۔ فہمیدہ النصاری نوجوان خاتون ہیں جو ان دونوں گلارسٹن (امریکہ) کے سنت میری ما سپیل میں www.technotalks.com ہستو مکنا لوجٹ کی چیزیں سے کام کر رہی ہیں۔ یہ میری ماں و زار بہن اور مولوی الحاج محمد عبداللہ النصاری (مرحوم) پیشکار درگاہ اللہ شریف ضلع گلبرگہ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں گلبرگہ میں پیدا ہوئیں اور ۱۹۸۸ء میں اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ حیدر آباد منتقل ہوئیں لہ داہمنڈ جو ملی اپر پر امری اسکول میں ابھی سکنڈیفارم میں ہیں کہ ان کی فتحیلی پاکستان منتقل ہو گئی۔ فہمیدہ بچپن ہی سے اپنے دوسرے بھائیوں اور بہنوں کی

لہ فہمیدہ کے دو بھائی اور تین بہنوں میں زبیدہ انصاری یہی ایڈ گورنمنٹ سکولز کی اسکول فیڈرل بنی ایریا کی پرنسپل ڈوسری بہن سعیدہ انصاری ہے ایں سی ۴۱ اسکول میں تدریس کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ تیسرا بہن رشیدہ اپنے سلیقہ کے لئے مشہور ہیں۔ معین بھائی یہم ایں میکانیکل انجینیر (ترکی) اور معز بھائی یہ ۲۰۰۳ء (امریکہ) ہیں۔

طرح ذہین میں اور حصول علم کے جذبہ نے کوئی دم لینے نہ دیا۔ وہ کراچی ۱۹۸۲ء میں
سے یہ ملکیت ہے اور امریکہ سے ایم ایم کی دُنگری حاصل کی ۶۱۹۸۲ تا ۶۱۹۸۴ وہ
رسیرچ اسوسیٹ کی جمیعت سے نکاس اے اینڈیم یونیورسٹی (امریکہ) میں صرف
رپس اور پھر ۱۹۸۲ء میں موجودہ خدمت پر مامور ہوئی ہیں۔ بھپن ہی سے ان کے تمام بھائیوں
اور بھنوں کی زندگی کشمکش اور رجد و جہد سے عبارت ہے وہ اپنی موجودہ ملازمت سے مطمئن
ہونے کے باوجود اسے بڑھنے اور مزید پڑھنے کا جذبہ رکھتی ہیں خیالات میں بلندی احوصلہ
میں عالمت اور ارادوں پھیلی ہے وہ ناصاعد حالات کا مقابلہ کرنا خوب جانتی ہیں "ہاں"
اور آرے چھوڑو" کہہ کر بڑی سی پڑی بات کو نظر انداز کر دیتی ہیں عفو اور دگذر
کا مادہ خوب ہے ابھی ذیر تعلیم ہیچ ماں آٹھ گیئیں اور وہ گلوکارشن میں ملازمت اختیار کر پڑی
چکی ہیں کہ ۱۹۸۳ء میں یہاں کراچی میں ان کے والد بزرگوار کا انتقال ہوا اور حد تو یہ
کہ وہ آخری دیدار سے محروم ہیں۔ ماںوں صاحب مشکل حالات میں اکثر کہا کرتے تھے "میں
سوئے کی بھٹی تیار کر رہا ہوں" اور اب یہ بھٹی تیار ہو چکی ہے اور سونا ہتھ کر کردن بن چکا
تو در رہیاں سے آٹھ گئے۔ کمال یہ کہ بخوبی اپنے دلن، خاندان اور اہل خاندان
سے دی جذبہ موجود ہے جو ماںوں صاحب کے دل میں موجزی تھا اور یہی جذبہ انھیں
دیا رہ دلن کشاں کھیڑک لارہا ہے دیسے ہی فہمیدہ ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بھترے

ہزار ہاشمیہ سائیہ دار راہ میں ہے!

کی تاکل ہیں۔ انھیں یہ بڑی خواہش تھی بچپن ہی سے کہ انہوں یا آئیں۔ لیکن ان کی یہ خواہش تقریباً بیتیس ۳۲ سال کے بعد پوری ہوئی تھی دو اپنی بہن سعیدہ آپا کے ماتھہ ہندوستان کے سفر پر نکل پڑیں۔ اور جب حیدر آباد پہنچیں تو انہیں لپنے پر انگری اسکول کا خیال آیا دو لپنے ماں اصغر حرب کے ہمراہ ڈائمنڈ جو بلی پہنچیں اور اپنے کلام کا دم کو جا کر دیکھ

"پہلی بار دین تازہ ہوئیں۔ بہت اپنائیت کا احساس ہوا۔" گلبرگ میرے مکان ہمان رہیں ہے اپنی لحابی کے ساتھ بارگاہ بننے نواز" پر حاضری دیں۔ وہاں جا کر دل بھرا آیا اور سکونِ قلب حاصل ہوا۔ درگاہ کی شان و شوکت دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ فہمیدہ کی پیدائش گلبرگ میں ہوئی۔ وہ اپنے تدبیم مکان کو دیکھنے کی چاہ رکھتی تھیں چنانچہ میرے ساتھ غازی پورہ گئیں۔ اپنے گھر کو دیکھا، تخت الشعور کا خاکہ کچھ بچھا بچھا سا آنکھوں میں گھوم گیا۔ فہمیدہ اپنی سنبھال تما پور بھی گئیں اور رشتہ داروں سے مل کر خوش ہوئیں۔ اللہ شریف ہمارا آبائی وطن ہے اس کے بارے میں وہ کہتی ہیں "دو دن کے بعد ہم اپنے آبائی گاؤں اللہ شریف گئے وہاں سب سے پہلے میں نے اپنے بزرگ حضرت لادٹے مشائیخؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ وہاں پر ایک عجیب سہنائیں محسوس کیا۔ مغرب کی نمازوں میں پڑھی اور حضرتؒ کی زیارت کے بعد اپنے خاندان کے لوگوں کے پاس گئی۔ وہاں سب سے زیادہ مجھے اپنی بھولوٹؒ اور دو چپاؤں سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ والدہؒ کے بعد اب یہی بزرگ میر سے نئے سب کچھ ہیں۔ ان لوگوں کا روایں رداں میرے نئے ایک نعمت ہے۔ یہاں پر اپنے باقی عزیز و اقارب سے بھی ملاقات ہوئیں اس سب سے حد خلوص اور محبت کا منظاہرہ کیا۔

فہمیدہ بے حد مخلص ہیں اور خلوص و پیار کی رسیا ہیں۔ انہیں اپنی علمیت کا خیال ہے اور نہ قابلیت کا احساس وہ چھوٹے بڑے، کمتر، برتاؤ را اچھے دیکھے لگا فرق کے بغیر سب سے ملتی ہیں، یکسان طور پر ملتی ہیں اور پیار اور لیگا لگتے سے ملتی ہیں۔ ان کے

ملئے میں اپنا نیت، ان کی گفتگو میں سادگی اور نشست دیرخواست میں بے تکلفی ہے۔

فهمیدہ اپنی سادگی اور سادہ مزاجی سے بہت جلد اپنے خاندان میں ہر دل عزیز ہو گئی ہیں
امریکہ، کینٹا اور بربٹانیہ میں جو برصغیر ہندوپاک کے لوگ بستے ہیں وہ
اپنی معاشری مرفع والی کے باوجود تہذیبی لحاظ سے بے چینی سی محسوس کرتے ہیں۔ ان کے لئے
اپنی اخلاقی اور مذہبی اقدار کا تحفظ سب سے اہم مسئلہ بن گیا ہے خصوصاً پھول کی
نگہداشت، ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی شادی بیاہ کے مسائل ایسے ہیں جو ساری مادی
ہمسائشوں کے باوجود پریشان کر رکھے ہیں ان ہی مسائل کی طرف میں نے فہمیدہ کی
توجه مبذول کرائی۔ فہمیدہ نے اپنے مخصوص اور سمجھیدہ انداز میں جواب دیا۔

”امریکہ میں ہم لوگ اپنے ماحول اور مذہب کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش
کرتے ہیں۔ آپس میں ملتے ہیں تو اپنی زبان بولتے ہیں۔ اپنے پکوان کرتے ہیں اور اپنا
ہندوستانی، پاکستانی بائس پہنتے ہیں۔ وہاں ہو سُن می اُردد کے کافی قدر داں خواتین و
حضرات موجود ہیں۔ مشاعرہ کی مخلفیں منعقد ہوتی ہیں ہو سُن کے ڈاکٹر ظفر نقوی صاحب
اس میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔“

ہندوستان اور پاکستان سے ہترین غزل گانے والے بلانے جاتے ہیں اور لوگ بہت
شوق سے جاگران کو سنتے ہیں اس طرح تمام بڑے شہروں سے ہر ہنہیں اردو کا اخبار بھی نکلا
ہے یعنی یونیورسٹی اسلامیہ اور کینٹا سے... تبلیغی کام بھی امریکہ میں کافی عددیں ہو رہے ہیں
سب سے بڑی تنظیم جو اس میں صرف ہے اس کا نام ہے اسلامک سوسائٹی آف نارٹھ
امریکہ ہے۔ اس تنظیم کا واحد مقصد اعلام کو برقرار رکھنا اور پھیلانا ہے۔ مہر حال ہم لوگ

لے فہمیدہ انصاری اسلامک سوسائٹی آف گلو سُن کی کوارڈ نیشنل آف سوسائٹیں اکیوڈیٹر
بھی ہیں۔

ہر دیس میں رہ کر پوری کوشش کرتے ہیں کہ اپنی اقتدار کو پروان چڑھائیں۔ مقامی امریکی اس بات کی قدر کرتے ہیں کہ ہم اپنے مذہب اور تہذیب پر قائم ہیں۔ نئی نسل کے مستقبل کے بارے میں البتہ کچھ عین لیقینی سی محسوس ہوتی ہے وہ لوگ دن رات وہاں کے حوال سے متاثر ہوتے ہیں ان کے ذہنوں پر دونوں تہذیبوں کا دباؤ ہے اس بات پر کچھ بے چینی سی ہوتی ہے۔"

نہیں نے نئی نسل کے تعلق سے اپنی جس بے چینی کا اظہار کیا ہے وہ ہندوپاک کے تمام تاریخی وطن کی بے چینی کو ظاہر کرتا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمان اپنی تہذیب کا تحفظ کر پائیں گے یا مغربی تہذیب کے اندر کے کنوئیں میں ڈوب جائیں گے اس سلسلہ میں مسلمانوں پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ملکیت اور اپنے کلچر کا تحفظ کریں بلکہ اسلام کی نشر و اشاعت میں اپنا گراں قدر روں ادا کریں۔ اس میں مشرق و مغرب کا تخفیض نہیں ہے اور یہ حقیقت ہے کہ آج ساری دنیا، امن، مسلمانی، مساوات، الفاظ، بھائی چارہ اور احترام اور دمیت ایسے آناتی اور عالمی اقتدار کی مثالیتی ہے۔ نسل پرستی علاقتاً ایت اور نظریاتی گردہ بندی نے اولادِ آدم کو منقسم کر کے رکھ دیا ہے اور اپنی تنگ خیالی کی وجہ سے انسٹکی زمین پر سرحدیں کھینچ دی ہیں۔ بلاشبہ مسلمان آج ہی دست ہے اور وہ روزگار کی تلاش میں امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا جیسے ممالک میں پھیل گیا ہے اس کا یہ نقل مقام عین اسلام ہے کیونکہ اللہ نے انہاں کا رزق ساری زمین پر بکھیر دیا ہے اور ہم رزق کی تلاش میں قریبہ قریبہ شہر شہر اور ملک ملک گھوم رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمان اخلاقی اور روحانی اقتدار سے مالا مال ہے جس تن دیہی اور جستجو سے وہ اپنا رزق سمجھ رہا ہے اسی تینزی اور گرجوشی سے وہ ان انسانی اقتدار کو عین دل میں تقسیم بھی کر دے۔ یہ بڑی ذمہ داری ہے جسے مسلمانوں کو پوری کرنی ہے۔ یہ سمجھتا ہوں اس کلم کو فرمیدہ ایسی ذہن، بیدار مخز اور انسانی اقتدار کا پاسخ رکھنے والی حزاں نور جو

۶۱

حضرات ہی بیجا جنم بہتر انعام دے سکتے ہیں۔
کبھی دریا سے مثل موج آمہر کر
کبھی دریا کے سینہ میں اُتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گذر کر
ستقام اپنی خودی کا فرش تکر

♦ ♦ ♦

جلیل تنوری

ایک بے نام سی چاہت کا احجال

جلیل تنوری کا شمار ہمارے ذہن اور باصلاحیت نوجوانوں میں ہوتا ہے زندگی ان کے نزد دیکھ سراسر عمل کا نام ہے۔ جہد پیغم اور محبت ان کا شیوه ہے شہرت اور پروپگنڈہ سے دور خاموش خدمت کے قابل ہیں۔ چاہے یہ خدمت خاندان کی ہو، سوسائٹی کی ہو، تعلیم و تدریس کی ہو یا پھر زبان و ادب کی ذمہ داری سے اپنے فرض کو بجانا حرب جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جلیل اپنے اہل خاندان میں، حلقة یاراں میں اور کالج کے اندر اساتذہ و طلبہ میں بیکار طور پر مقبول ہیں۔ جلیل تنوری نے جب آنکھیں کھوئی ہیں تب زین پر بہا انسان کا خون سوکھ گیا تھا لیکن اس کی سرفی اب بھی چھیلی ہوئی تھی اور خدن کے آنسو دلاتی تھی۔ ۱۹۳۸ع کے خونین حادثہ میں دوسرے بہت سوں کے ساتھ ان کے والد کو بھی شبید کر دیا گیا تھا۔ معاشری لحاظ سے خاندان تباہ تھا اور مستقبل مایوس ہوا کے اندھیرے میں کہیں گم سا ہو گیا تھا جلیل تنوری نے جب ان سارے واقعات کو سُنا اور اپنی اور اپنے اہل خاندان کی بے بسی اور اپنوں کی بے مرمت کو دیکھا تو اس کا سخفا سادل بیٹھ گیا۔ وہ کھیلنے کو دنے کے زمانے ہی سے سوچنے لگا "یہ زندگی کیا ہے۔"

اور ایسے میں
لمحہ لمحہ میرا سنگ وجود
پارہ پارہ ہونے لگا ہے
بکھرنے لگا ہے چار سو
مگر آخر شب
سکڑتی تاریک را ہوں میں
ایک بے نام سی چاہت کا اجالا
میری زندگی کا جواز ہو چکا ہے (جواز)
ایک بے نام سی چاہت کا اجالا اگر جلیل تنوری کی زندگی میں نہ پھیلتا ہوتا۔ یہ اجالا
اگر اس کے قلب کو منور نہ کیا ہوتا اور اس اجالے کی روشنی میں اس کا ذہن سوچنے نہ لگتا
ہوتا تو جلیل تنوری ہزاروں ستم زدہ انسانوں کی طرح مایوسیوں کا شکار دریدر کی ٹھوکریں کھاتا
پھرتا۔ بخلاف اس کے جلیل تنوری کی بصیرت نے تنگ و تاریک را ہوں میں چلنے اور
آگے بڑھنے کا حوصلہ بھر حال پیدا کر ہی لیا اور دنیا سے، اور اپنے آپ سے ایک طرح کی
ڈابتگی ”پیدا کری۔“

کیا نہیں ہے میرے پاس
پھر بھی
سپیدی صبح کی
صاراتی ہوا، چمکتے سچوں، چمکتی چڑیاں
اور
در در تک پھیلی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندی

یہ سب کچھ دیکھتا ہوں

دیکھتا ہی رہتا ہوں۔

اور محمد محب ایفیں میں کھو کر رہ جاتا ہوں۔ (وابستگی)

جلیل تنوسیر کے قلب و ذہن میں اندر ہیرے اور آجائے کی ایک عجیب سی کشمکش بخوبی
نظر آتی ہے۔ اس کشمکش کا پرتو بخوبی اس کی اپنی زندگی میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ
اندر ہیرے سے سہما سہما اور کبھی آجائے کا شیدائی اور پھر آجائے کو پیک کر تسبیح کرنا
چاہتا ہے۔ یہ زندگی کی جیت ہے زندگی کا یہ اثاثی عمل صرف اس کو اپنی زندگی سے پیار کرنا
سکھاتا ہے بلکہ وہ اندر دن ملک پھوٹ پڑتے فعادات اور بیرون ملک منڈلاتے
جنگ کے باولوں کے خلاف نفرت کے احساسات و جذبات بھی پیدا کرتا ہے۔

دہشت پسندی، تحریک کاری زمین کے ہر حصے کا مقدر بن چکی ہے
اقوامِ عالم کی وہ بلند و بال عمارت

سرنگوں ہے پستی ذہن انسان پر
تہذیب و تمدن کے آسمانوں پر پنچھی دنیا
آج بھی ایک حق پرست شاعر کو بخش نہیں ملتا
حق کا خون کل بھی ہوا تھا آج بھی ہوا ہے
نهذب زمانے میں (خون)

نهذب زمانے پر یہ گھراطنز محض سطحی احساسات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے پچھے
ماضی اور حال کے سارے واقعات اور حادثات ہیں جن کے بارے میں اس نے سنا اور جن
کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے یہ تجربہ اور مشاہدہ صرف جلیل تنوسیر کا اپنا ذاتی ہنپیں ہے بلکہ
ہر ذی حس ادیب و شاعر نے اس کو دیکھا اور سنا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کے

دل میں یقیناً خوف پیدا ہوا ہے چنانچہ شمس الحق عثمانی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ
عمر قدر ازانت فسادات کے تجربے کا اظہار اُردو ادب کا ایک تاسف انگلیز سرمایہ ہے:
(ماہنامہ شاعر جلد ۸، شمارہ ۷، صفحہ ۱۰) اس تاسف کا اظہار ہمیں اُردو کے
بے شمار شاعر دل اور رہیوں کے یہاں نظر آتا ہے خصوصاً جلیل تنویر نے اسی
 TASF کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ اس مسئلہ میں ان کی نظم "بکھری سانیں" اہمیت
 کی عالی ہے یہ نظم جلیل نے اس وقت قلبند کی جب وہ جوان عمر ہیں اور مدتِ مدید کے
 بعد پہلی مرتبہ اس مقام کی "زیارت" کرتے ہیں جہاں پولیس ایکشن ۲۰۰۶ میں ان کے والد کو شہید
 کیا گیا تھا۔ یہ ایک طویل نظم ہے اور اس طویل نظم میں جلیل تنویر کا سارا کرب سمجھتے
 کر مجتمع ہو گیا ہے مگر اس خونین حادثہ نے جلیل تنویر کو یہاں بھی میوس نہیں کیا ہے بلکہ
 بکھری سانسوں کو مجتمع کرنے کی ایک سچی مبارک ملتی ہے

تم تو تہنا گئے

مگر تمہارا کاروں، پچھے تمہارے
اپنی بکھری سانسوں کو مجتمع کرنے کی سچی میں

اب تک محو ہے

•
تسلی سانسوں کا ٹوٹا نہیں ہے۔ (بکھری سانیں)
یہ رجائیت، یہ حوصلہ، یہ امنگ اور زندگی کرنے کی یہ خوبی جلیل تنویر کی ذات کی
بھی اور فن کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اسکی وجہ سے دو زمانہ کے گرداب سے اُبھر کر
تلخی آیا ہے۔ اب وہ خود سے اور اپنے عصر کے اندازوں سے پوچھتا ہے

آدمیوں سے ہمدرم میرے مونس

بسو چین کچھ علاج بے امانی

اور انڈھی ساعتوں کو کچھ روشنی دیں

تسلسل جبر کا، قہر کا کب تک

میرے ہمدرم میرے مونس (درماں)

جلیل تنوری کی یہ دعوت فکر جبر و قہر کے خلاف صرف اس کی شاعری کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے افانوں میں بھی اس کی گوئی نظر آتی ہے "حصار" کے بیشتر افسانے اسی رنگ و خون میں ہنگامے ہوئے ہیں تاہم اس مجموعے کے آخری چار افسانے نئی کہانیوں کے نام سے داخل کتاب ہیں حاتم طائی، پردواز، رعایت اور انقلاب — یہ چار کہانیاں حصار کو متنوثر بنانے میں یوں مددگار ثابت ہوئے ہیں کہ ان کا موضوع فسادات، خون خسراہ اور زندگی سے ہٹ کر سماج کی دوسرویں اور براہیوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ جلیل تنوری ایک باشور فن کار ہیں اور وہ جو کچھ سوچتے ہیں وہ وہی لکھتے بھی ہیں اور لکھتے کا یہ عمل ہے مقصد بھی نہیں ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

"میرے نزدیک فن کا محرك صرف سطاحر ہی نہیں مشاہدہ اور مجاہدہ

بھی ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر میں نے جدوجہد کیا ہے۔ سماج کے بڑے

لوگوں کے قول و فعل میں تضادات بھی دیکھتے ہیں۔ ہمارے معاشرہ کی

غیر متوازن فہادت نے جو انتشار و بدآمنی پھیلاتی ہے اس کو نہایت قریب

سے محسوس کیا ہے۔ بجهالت، بیماریوں اور افلاؤں میں بستلا ان انوں نے مجھے

بہمیشہ اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور معاشرہ کی اس غیر متوازن فضادر کے خلتم

کے لئے ایک زیر دست اتفاقاری انقلاب کو ناگزیر سمجھتا ہوں۔"

اقصادی انقلاب کی یہ آرزو جہاں زندگی اور خون خراب سے نفرت کا اظہار ہے ویسیں
مواشرہ کی خوشماں کا آئینہ بھی ہے تاہم یہ نکہ جلیل تنویر کو کوئی "پیر روی" ہی سمجھا سکتا
ہے کہ اقصادی انقلاب روحانی قوت کے بغیر ممکن ہنیں ہے جب تک انسان کو اقتصادی
مسادات کا معیار فراہم ہنیں ہو گا اور جب تک وہ معاشی استحصال کرنے والوں کو پہچاننے کا
شعور حاصل ہنیں کر سے گا وہ زمانہ میں انقلاب بروپا ہنیں کر سکتا۔ اس لینے پر سے خال
میں جہاں اخلاقی اقدار کے استحکام کے سے ایک توازن اقصادی اور مادی نظام کی ضرورت
ہے ویسیں اقصادی اور مادی اصولوں میں توازن پیدا کرنے کے لئے روحانی اور اخلاقی
تعلیم بھی ضروری ہے۔ بات میں ختم ہنیں ہوتی۔ جلیل تنویر نے فادات اور جنگ کے
خلاف اپنی جس نفرت کا اظہار کیا ہے اس فارا در جنگ کا خاتمہ وحدت آدم کے تقدیر
کے بغیر ممکن ہنیں ہے۔ اصل میں حیاتِ انلن مادی اور روحانی اقدار کا ایک حصہ امتزاج
ہے۔ اس حقیقت کو ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے اور اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر انان
یوں ہی در بدر کی مٹھو کریں کھاتے چھرتا رہتے گا۔

علیم صبآنویدی

روشنوار سیکھائیں، کس کو دکھلائیں

علیم صبآنویدی اردو مشاعری میں اپنے نت نئے تجربوں کے لئے مشہور ہیں۔ وہ کبھی آزاد غزلیں لکھتے ہیں اور کبھی جدید شیپ بند نظمیں لکھتے ہیں اور کبھی جدید سعائیٹ کی طرف یہ مائل رہتے ہیں اور اب ہائی کو نظمیں لکھ کر اردو کے قاری کو اپنے انداز میں دعوتِ سخن شناسی دے رہے ہیں۔ ”ہائی کو“ یقیناً اردو ادب میں یا انکل ایک نئی چیز ہے لیکن ہے تو یہ جا پانی گڑ یا کی طرح خوبصورت اور مل آورت! اس لئے میں سمجھتا ہوں اردو کا قاری اس منحصرہ نظم کو ضرور شوق و ذوق سے پڑھے گا۔ اگر قاری نے اس ضفی سخن کو شرفِ قبولت سختا تو سمجھئے ہمارے ناقدین فن خود بخود مائل بہ کرم ہوں گے۔ دیسے بھی دور حاضر کے اکثر و بیشتر نقادر ان فن نے علیم صبآنویدی کی طرف خاص توجہ دی ہے چنانچہ اب تک ان کے جتنے بھی شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں ان میں ملک بھر کے نقادر دن نے اپنی آراء کا انٹھا رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اب یہ جو ”ہائی کو“ نظموں کا مجموعہ ”تشدید“ منظرِ عام پر آئے گا تو یقیناً اہل خرد چونک اُٹھیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ شاعری میں تجربے ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں اور ہمیشہ ہی سے "سکھنند" قسم کے نقا دا وقاری نے ان تجربوں کو ناپسند کیا ہے یا پھر شہر کی نظر سے دیکھا ہے اردو شاعری میں جس شاعر نے سانی بنیادوں پر کئی زبان میں سخراجوئی پر اصرار کیا وہ نظائی بھی ہیں در نز فارسی زبان میں شعر کہنا و جہہ افتخار تھا۔ ولی کئی نے نہ صرف سانی بلکہ مہنمود عالی تجربے کیے اور رایتی مثنویوں، ہجو اور قصائد سے ہٹ کر غزل کے نئے اسلوب کو عام کیا اور ان کا یہ تجربہ شماں ہند میں مقبول ہوا تاہم مرثیہ، قائم اور دیگر شعرا نے ولی کی "لچری زبان" کے برخلاف فارسی آمیز اردو پر زور دیا۔ اس تحریک کے نتیجے میں ہمیں درد، مدیر، غالب اور ذوق ایسے بلند پایہ شعرا ملے۔ انسویں صدی کے آخر میں سرپید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کے زیر اثر حال اور مشبلی نے رایتی شاعری کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس طرح اردو شاعری کو آقبال ایسا بلند قامت شاعر ملا۔ ترقی پسند تحریک نے فکر و فن کے سہارے نئے تجربے کیے اور نظم کے ساتھ ساتھ نظر میں بھی خایاں تبدیلیاں آئیں۔ یہ ساری تبدیلیاں فن دلکر کے اعتبار سے جہاں ہمارے بدلتے اور بلکھلتے ذہن کی نمائندگی کرتی ہیں وہیں ہماری اس آرزو کی غاہی بھی کرتی ہیں کہ ہم ادب اور زندگی میں محنت ہند تبدیلی لانا چاہتے ہیں مگر انہوں ادھر کھپلی ربع صدی میں جدید پیٹ کے نام پر جو بے ہنگام تجربے ہو رہے ہیں ان کو دیکھ کر متلی سی ہوتی ہے۔ میں نئے تجربوں کا منکر نہیں ہوں۔ یہ تو ہماری فطرت میں داخل ہے۔ لیکر کے ذیقت بینے رہنا ایک بخیر فطری عمل ہے، موت کی علامت بھی۔ لیکن ہمارا یہ تجربہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہونا چاہئیے۔ ادھر کھپلے پہیں یہ صویں میں جن شہزادوں اور ارادہ پوں نے اپنے نت نئے تجربوں کی وجہ سے شہرت پائی ہے ان میں ہلیم قیتاً فوپی بھی شامل ہیں۔ اور ان کے ان نئے تجربوں کو اکثر سراہا گیا ہے۔

لقول ڈاکٹر مظفر حسین ... "اکثر غزلوں میں اپنے اور خلائق کے اسپارک جھلک دار ہے میں،" اب یہی اسپارک مجھے ان کی ہائی کو نظموں میں آب دار موتیوں کی طرح چمکتے اور فہکتے لگتے ہیں!

بلڑاج کوئل نے ماہ نامہ شاعر (جلد ۸۵ شمارہ ۸) میں محمد الماس سے متعلق تخلیق دریافت اور کامرانی "کے زیر عنوان صفحہ "ہائی کو" کی اس طرح تو ضمیح و تحریف کی ہے۔

"ہائی کو میں تین صürü ہوتے ہیں۔ پہلے صürü میں صورت حال کا ذکر ہوتا ہے۔ دوسرا میں بھاتی پرواز اور تیسرا میں طلوع نقش یا حیرت و استعجاب کا اظہار۔ ہائی کو کے معنای میں موسم کے رنگوں، اس پاس کی عام زندگی کے تجربوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ طریقہ اظہار اور سیکر شائستہ اور الفاظ علم بول چال کے الفاظ ہوتے ہیں۔"

ہائی کو کا آخری صürü بالحروف کسی نہ کسی اسم NOUN پر ختم ہوتا ہے ہائی کو نے ملی جلتی ایک اور جاپانی صفحہ سنخ بھی ہے میں رائی YOHESEN ہے میں رائی YO میں صوروں کی تعداد تو ہائی کو کی طرح تین ہوتی ہے لیکن ہائی کو کے بر عکس میں رائی YO میں طنز، تضیییک، تمسخر کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں سوی رائی YO آخری صürü میں آخری لفظ کو میں اسیm NOUN کی صورت میں لانے کی قید سے بھی آزاد ہے اور موتیوں کے تکلف سے بھی۔ ہائی کو اور میں رائی YO میں پہلا صürü پارچ سیبلز SIBLLES یا 77 LABES پر مشتمل ہوتا ہے دوسرا میں اس پر اور تیسرا پھر پارچ پر۔"

علیم چیانویڈی "ہائی کو" اور "میں رائی YO" کی فنی بائیکوں سے واقف ہیں اور اسی واقفیت اور اداک کے ساتھ انہوں نے "ہائی کو" کی طرف توجہ دی ہے "ہائی کو" کا یہ تجربہ

اُردو میں لاکھ نیا ہی مگر جاپانی گٹھیا کی طرح اُردو کا قاری اس صنفِ سخن کو عزیز رکھے گا۔ پھر یہ سخن پھیلوں کے دل بہلا نے اور کھیلنے کی چیز نہیں۔ علیم صبایا نویدی نے اپنے احساس و ادراک اور شعور و آگہی کی مدد سے اسے بصیرت افراد پنادیا ہے۔ یہ اُردو میں فنا خیہ کی چیز ہے علیم صبایا نویدی نے جہاں اصنافِ سخن میں اپنے تجربوں کے ذریحہ اپنے جدید ذہن ہو نے کا ثبوت فراہم کیا ہے وہیں نجتیہ اور حمدیہ شاعری کو اولیت دے کر اُردو کی ایک صحت مند صارع اور مقدس روایت کی پاسداری بھی کی ہے اور اس طرح اپنی سوجھ بوجھ کا ثبوت فراہم کیا ہے چنانچہ "تشدید" کا آغاز حمدیہ "ہائی کوئے ہوتا ہے" ہے

اے ربِ عالم
ذات ہے تیری پاک، پوتھر
نورِ جسم !

سب کا ہے ربِ تو
تیرے بس میں رونوں جہاں
شیریں لبِ تو

ڈراؤں میں پہاں
تیری خدائی کے جلوے
تو ہے نورِ افشاں

اسی طرح نعمتیہ "ہائی گو" ملکا حظہ ہوں ہے

شاہِ مدینہ

دین و دنیا کے راہ بر

نوری نگینہ

امیٰ لقب وہ

غیر البشر اور شاہِ دین

روشن نسب وہ

خلستِ الہی پر گواہی اور عشقِ رسولؐ ہی ترڑپ اٹھنا ایک نورانی منظر پیدا کر دیتا

ہے سہ۔

دقت کی دہلیز پر

زمین آسمان سجدہ کھان

نورانی منظر

علیم قیباً نویڈ کرنے اس نورانی منظر کو اس مجموعہ میں اپنی خوش عقیدگی اور خوش فکری

کے سہار سے بنائے رکھا ہے!

میں شعر و نثر میں بنیادی طور پر عقیدہ کو مانتا ہوں۔ عقیدہ صحیح رائیخ اور سچا ہو گناہ
تو نکر کی سطح بھی صحیک صحیک ہو گی اور آدی سمجھنکے ہنیں پاتا۔ ہمارے اکثر جدید مشراء، اپنی
بد عقیدگی کی وجہ سے بھٹک کرے ہیں اور ان کے یہاں فکری بے راہ روی جیسے مقصد بن گئی
ہے اس بیماری دل کا علاج نہیں ہے یہ اس لئے کہ یہ کوئی بیماری نہیں ہے بلکہ شوری
کو رشتہ کا نتیجہ ہے اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ وہ پاگل کہلاتے ہے اور اس لئے پھر رات تا پھر ترا

ہے تو قاہر ہے اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ علیم قبیلانویسی کی ایک پا شور شاعر ہیں اور وہ اپنے منصب سے خوب واقف ہیں چنانچہ ڈاکٹر گیان چند جیسے اس بات پر اپنے اطمینان کا انہار کیا ہے اور لکھا ہے!

”مشکر ہے کہ اپنی تمام آزادی کے باوجود وہ عقیدے کی قید سے آزالو

نہیں۔ ”نقشِ گیر“ کی پہلی نظم میں سمجھتے ہیں ہے

میرافن اس کا ہے، جس نے

ایک قطرہ سے مجھے پیدا کیا

یہاں ان کے قبلہ گاہ کی طرف اشارہ نہیں بلکہ بڑے خالق کی حمد ہے ॥

ڈاکٹر گیان چند صرف علیم قبیلانویسی کی خوش تھیڈگی کی طرف ہی نہیں کی ہے بلکہ

امہروس نے ان کے خوش فنکر ہونے پر زاد بھی دیا ہے۔ مجھے تشدید میں بھی لیے ہی فکر و خیال

کے ”اسپارک“ یا جزیرے ملتے ہیں جو تشنگانِلب کی پیاس بخانے کے لئے کافی ہیں ہے

چکنی مٹی کے گھر

سلاب و طوفان کی غذا

آخری سفر

لمحون کی خوشبو

قامت کی جسمانی میں پختہ

قسطروں میں آنسو

فرشتر صفت چہرے
سفید لباسوں میں قائل
سانپ اور سپیرے

سب صحیحے پاک
نیت میں کالا جادو
دنیا حیرت ناک !

دال آٹے کا بھاؤ
سرما یہ داروں کی جیت
سینہ سینہ گھاؤ

وقت کے ہاتھوں میں
خون ہے کتنے ارماؤں کا
بخت ہے گھاؤں میں

روشن ریکھائیں
فکر و فن کے ہاتھوں میں
کس کو دکھلائیں

علم صبا فیدیکی چاہئے آزاد غزیں کہیں یا ٹیپ بند نظمیں لکھیں، چاہئے رہنمایی

مکھیں یا "ہائی کو" وہ ہمارے سماج کے ایک باشورہ ان ان ہیں اور ان کے فن کے
ہاتھوں کی ریکھائیں فکر نو کی وجہ سے روشن اور تابناک ہیں وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کے لوگوں
ان ریکھاؤں کو دیکھ کر اپنی زندگی کی راہوں کو روشن اور تابناک بنائیں۔ "تشدید" ان
ہی محفوظ میں علیم صبا نویدی کے ہاتھ کی ایک تازہ ریکھا ہے جو روشن اور چمکدار ہے اور
مجھے لعین ہے یہ افقِ شعر پر دیر تک اور دُور تک یوں ہی چمکتی رہے گی ۔

:

فضل گل بگوئی

”آج اک کُشتہ آلام سے باتیں کی ہیں“

شاعری کو مختلف خانوں میں بانتا نہیں جا سکتا۔ یہ ایک اکائی ہے جو کل پر محیط ہوتے ہے اور اس کل میں اپنی کے نقوش، حال کا احوال اور مستقبل کی آہٹ سمجھی کچھ دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے ”رُوئے گل“ کی شاعر فرمیرے زدیک ایک اکائی کی جیشیت رکھتی ہے حالانکہ اس میں اپنی کی کرہنا کی، حال کی اضطرابی کیفیت اور مستقبل کے رصدندے کے سمجھی کچھ شامل ہیں۔ خصوصاً ان کی نظمیں صنوعات کے اعتبار سے منقسم ہیں مثلاً طبل جنگ مذاریکٹ، ایکشن، چند حصی جنگ ملاقات پر اور نور قائدِ ملت وغیرہ اپنی کا حصہ ہیں۔ لیکن ان کی ایک نظم ”والعصر“ ان کے تصور زمان و مکان کی عکاس ہے اس نظم میں فضل نے سورہ عصر کو منقول کیا ہے یہ نظم مجموعی جیشیت سے مجھے بہت خوبصورت محسوس ہوئی اور پوری نظم دہرا سے جانے کی قابل ہے تاہم چند شر نقل ہیں۔

چند سالوں کا تسلسل ہے حیات
زندگی کیا ہے۔ بجز ایک سفر
کتنی تبری سے اڑا سا ہے
نازد ہے لیے بڑھ کے کافی وقت کے پر

کیا اسے قبیر مکانی سمجھوں ؟
وہ مکان جس کے نہ دیوار نہ در
وہی لمخات کا بہتا در یا
وہی دن رات وہی شام و سحر
وقت کے کس پہ کھلے ہیں اسرار
سب نے ڈالی ہے یہاں آکے سپر

وقت کی اسی پُر اسراریت کے سامنے انسانی کی عقل، عاجز، علم و ہنر بے بس، انکرو دانش کا گولی اور نہ چھوڑ، فلسفہ بے سر و پا اور "چھان کر لائکہ خرد کے دفتر" ہے

بھی جانکر نہ سانا کچھ بھی

بستیاں غاک ہوئی جاتی ہیں آنکھ کب دید ووران کھولیں گے

سلک اپنا عشق و محبت مذہب اپنापیار پسیت ہی اپنا دین دھرم ہے پنجم براد تار
چاند نی چاند نی، روشنی روشنی کھلکشان کھلکشان پیار کے راستے
”روٹے سے گل“ کے مطابعہ کے دوران میں جو جذبات عجیب کی کیفیت سے نوچار
ہوئے۔ تسلیم اور بیجان دونوں ہی قسم کے احتمالات موجود ہیں اور اس مطابعہ کے
دوران ایک الیسے شخص سے ملنے کا تجربہ ہوا جو انہماں پر سکون ہے اور انہماں بیجان
ایگز بھی، انہماں پر غلوص اور انہماں جذبات بھی اور ایک الیسے شخص سے جواب ہمارا
ہوتے ہوئے بھی ہم ہی میں کہیں چھپا بیٹھ لے اور سرگوشیوں کے انداز میں کہہ
رہا ہے ہے

وصل کی شب حجاب کی بائیں سیکدے میں عذاب کی بائیں
یا کرد تذکرہ، آن سانکھوں کا یا کرد پھر شراب کی بائیں
فضل گلبرگوی سے آؤ سین فضل کی بائیں گلاب کی بائیں
گلبرگہ گو یا فضل کی سب سے بڑی کمزوری ہے جب وہ پہاں سے آٹھے ہیں تو وہ
جذباتی لمحات کا جذباتی اقدام تھا اور اب جو جذبات کے بادل چھٹے ہیں تو ہے
دھیان میرا سوئے گلبرگہ چلا

اور گلبرگہ سے آنے والوں کو رد کر دو جپیٹر چپیٹر کئے پوچھئے ہیں ہے
میرے شہر سے آنے والو، آن گلیوں کا حال سناؤ

کیا اب بھی ان گلیوں میں ہم سے دیوانے پھرتے ہیں

”روٹے گل“ بلاشبہ فضل گلبرگوی کا ایک خوبصورت شعری جمود ہے تاہم یہ ان کی
شخصیت کا کلی طور پر احاطہ نہیں کرتا۔ پہاں تھے جذبات کا تسلیم بھی نہیں ملت، بکھراڑ
ہے! خیالات بے ترتیب اور اھوڑے ہیں ناممکن ہیں بخوبی میں خیالات کا تسلیم اور ترتیب
دیسے، ایسا بے معنی بات ہے تاہم اس بے ترتیبی میں بھی ایک طرح کی وحدت ہے جیسے میر اور

غائب کی غزل ! لیکن تشنگی کا احساس تو سب سے زیادہ نظم میں ہوتا ہے اس جمیونہ
 میں شاید وہ نظیمیں شامل نہیں ہیں جن پر ہونا چاہئے تھا۔ اس کے نتیجہ میں شعری پیکر
 آدھے، ادھور سے اور نامکمل ہے لگتے ہیں۔ شاعر کا اب تک بھی پوری طرح اُبھرنے نہیں
 پاتا۔ اس نئے میرے خیال میں رد سے گل فضل کا نمائندہ شعری مجموعہ نہیں ہے تاہم اس
 کے مطابق سے فضل کی پہچان ممکن ہے اور مطابق کے دوران لگتا ہے۔
 فضل سے مل کے ہم آنے تو یہ محسوس ہوا
 آج اک کشتم آلام سے باقیں کی ہیں

ڈو ڈو ڈو

سیلان خطیب

”میں انمول ہمیرا ہوں دکھن کے کھن کا“

۱۹۶۷ء کی بات ہے محدث آہاد کے اردو ہال میں اُردو مجلس کا ادبی اجلاس تھا وہ آنکھ
میں سجاد نہیں، سردار جعفری اور مسعود حسین صاحب کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اُدھرے
مجھے گزرتے مسعود صاحب نے دیکھ لیا۔ بڑی شفقت سے قریب بلا یا اور پہلی مرتبہ ہیں
میں سردار جعفری اور سجاد نہیں مٹا جان سے مٹا۔ ہمیں یادگار جلسے میں سیلان خطیب
صاحب بھی شریک تھے۔ کچھ نکلتا اور کچھ دبتا فد، فربہ جسم اور اس پر چوڑی دار پائچا مامہ
ادلن کی کالی شیر دانی زیب تن کیجئے ہے نکھوں پر جنمہ پڑھائے اور خصوص مسکراہٹ،
شرارت ذمہ کی جعلی کھاتے ہوئے۔ گردن پر بکھرے پھیلے بال اور سر پر ٹوپی اس طرح پہن کی
تھی کہ لگتا تھا خطیب صاحب ٹوپی صورت پہنچتے ہیں۔ دیسے بھی دہ اپنی محییت کی کمی کو
چھپانے میں یاد طبعی رکھتے تھے عیب کو چھپاتے کی یہ عادت اپنی فاتح کی حد تک ہی محدود نہیں
تھی لہ اپنوں کے عیب اور اندول کے نہز بھی اسی تین دہی اور دیگران سے چھپایا کرتے تھے اہول
نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو کبھی اپنی ذات سے الگ نہیں کھانا تھا مسعود صاحب نے بہت
مسکراتے ہوئے خطیب صاحب کو آواز دی۔ وہ ہمارے قریب آتے سے مسعود صاحب نے میری

طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”خطیب صاحب! آپ انہیں جانتے ہیں؟ یہ آپ کے پیہاں گلبرگہ آرہے ہیں۔ ذرہ انہیں سبق لینا!“ مسعود صاحب ماہر لسانیات ہیں اور لفظوں کے استعمال میں بڑی وہارت رکھتے ہیں۔ میں نے پہلے تو بھی سمجھا کہ وہ چھیرنے کے انداز میں میری نثار توں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں لیکن گلبرگہ آنے پر پہلے چلا کر اصل میں ان کا شعوری یا غیر شعوری اشارہ گلبرگہ کے ماحول کا طرف بھی تھا اور عجیب ہاتھ ہے کہ اس وقت خطیب صاحب نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑی دیر تک باقی کرتے رہے، دبجوئی اور دلداری کی باتیں، اسی ہلزون کو اہنوں نے دم والیں تک بھایا۔ گلبرگہ میں میرا قیام ان کی ذات کی وجہ سے بڑی حد تک ہنگاموں کو جنم دیتا رہا۔ وہ خود پچھے بیٹھتے تھے اور نہ اور وہ کو بیٹھنے دیتے۔ وہ میرے لیے تحریک تھے، حرکت دعل کا سرچشمہ تھے۔ اور ڈھال بھی تھے۔ وہ میرے ناقہ بھی تھے عجیب جو بھی! لیکن اس سے برٹھ کر وہ میری ”دل مدائی“ بھی کرتے تھے جب بھی نظم ہوتی یا فرستادہ میرے گھر الجوان شاہی کا لونی ہندرست آتے۔ وہ دروازے میں داخل ہوتے ہی آواز دیتے۔ ”پرد فیسر! اپھر اور پر آتے، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے، سیر ٹھیان چڑھتے ہوئے۔ ان کے چلنے اور سکوٹر چلانے میں بہت کم فرق ہوا کرتا تھا۔ وہ پہت دھیجے چلتے اور سکوٹر کی رفتار بھی ایسی کہ چھوٹا سا بچہ روڑ کر ان سے آگے نکل سکتا تھا۔ کمال تو یہ کہ وہ رات جب الجوان شاہی کا لونی سے فلٹ بڑز نکلتے تو ان کی سکوٹر کی رفتار کو دیکھ کر ایسا لگتا کہ وہ محض اٹپ پر سکوٹر چلا رہے ہیں، اندھیرے میں، اس اندھیرے میں راہ کو دیکھنے کے لئے ان کے سکوٹر کی لائٹ ان کے بیچ کافی تھی۔ خطیب صاحب نے اپنی زندگی کے گزارنے اور سفر کے کہنسیں دھریوں سے کبھی رشی مبتوار نہیں لی تھی۔ وہ زندگی کی صلیب اپنے ہی کندھ پر اٹھاتے پندرہ سوستان بھر گھوستے اور مشاہر سے بڑھتے اور لوٹتے رہے۔ یہاں بھی وہ بوجھ اٹھانے

سکنے پہنچنے والی سے عادی تھے، ان کی بیانی نے انہیں زندگی کا بڑا حوصلہ دیا تھا۔ وہ کسی یونیورسٹی کی ڈگری تو نہ رکھتے تھے مگر شعر کچھ اس طرح کہتے کہ اچھے پڑھے سخون کے کان کاٹ لیتے تھے۔ ان کی زندگی میں جو بے نکلفی اور سادگی تھی وہی ان کے شعر وہ کی بہچا نبھی تھی۔ وہ کوئی دانشوار آدمی تو نہ تھے، عام آدمیوں کی طرح تھے لیکن ان کی بیانی اور کثیرالحیاتی نے زندگی کے درد و شکر میں کمر لیا تھا اس لیے دشمنوں کے دلکھ درد کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ جب بھی وہ شعر کہتے سننے والے بھی سمجھ کرداد دیتے کہ یہ ان کے دل کا درد ہے۔ خطیب صاحب نے اپنی شاعری میں دیدہ درسی کی کم اور فلداری کی باتیں زیادہ کی ہیں اور عام انداز میں کہی ہیں اور سچ عروایی زبان نے تو ان کی شاعری کو کشیر سے لے کر کھایا کھاری تک گھر گھر پہنچا دیا۔ وہ کہتے تو شعر دکھی زبان ہیں تھے مگن یہ ہجہ سریکر میں بھی مقبول ہوا اور مدد اس میں بھی۔ جو لوگ خطیب صاحب کی زبان کو ادی اور حفیتر جانتے تھے وہ بھی خطیب صاحب کی مقبولیت کے منکر نہ تھے بلکہ بجلتے تھے۔ میں نے اکثر شاعر دل کو خطیب صاحب کی زبان اور شاعری کا مذاق اڑا کر اپنی آنا کو تسلیکن دیتے دیکھا ہے مگر میرے فردیک ان کی حالت، نمیشہ قابلِ رحم رہی ہے۔ اکثر ادھات، ہم لوگ چڑھتے سورج کو دیکھنے کی بجا تھے اپنی ہمیں موندے کے سورج کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ چوں کہ خطیب صاحب کو اپنی شہرت اور مقبولیت کا پورا پورا احساس تھا اسی لیے انہوں نے اپنے بعض معاصروں کی مخالفتوں کی پرواہ نہیں کی وہ ان سخت مراجلوں سے یوں ہی ہنس کر گزر گئے۔ گلبرگہ میں جب ان کا جشن مانا پا گیا تھا تو مجھے یاد ہے ہندوستانی بھر کے ادیبوں اور شاعر دل نے عموم کی ہی طرح اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا لیکن یہیں مقامی پہنڈ شعراوں ایسے تھے جن کی حالت پس نہ آتا تھا۔ وہ الزام دیتے تھے کہ محمد علی صاحب (در جوہم) کی مہر بالی صیہ سب کچھ ہمارا ہے حالانکہ "مولوی صاحب" کا خود خیال تھا کہ وہ جیسی خطیب مانا کر خطیب صاحب، پر کوئی احسان نہیں کر رہے ہے میں بلکہ اپنا فرض پورا کر رہے ہیں۔ خطیب صاحب اردو

کے ان خوش قسمت شعروں سے ہیں جن کی قدر افرادی ہوئی اور بہت ہوئی اور کمال یہ کہ
بھیتے چاہوئیں اخوبی کی بات کہ خود خطیب صاحب کو اپنے وجود کا پورا پورا احساس تھا اور
یہ بحض شاعرانہ تعلی نہیں تھی جب انہوں نے کہا تھا۔

میں رستے کی پنچی ہوں دیپک ہوں مئی کا

یہ سارا اجہا لایہ سے میرے سخن کا
مجھے پیٹھ پہچانے لوگا پنج میرے
میں انمول ہمیل ہوں دکھن کے کھن کا!

نوبس بیت گلے رستے کی پنچی۔ بچھے گئی اور میں کا دیپک گلہ ہو گیا مگر سخن کا آجالا
اب بھی پھیلا ہوا اپنے جشن کے نہانے کے بعد یقیناً خطیب صاحب کا یہ احساس چاٹا رہا ہو گا
کہ ان کے لوگوں نے انہیں نہیں پہچانا۔ وہ اپنی قدر دانی پر مسرور تھے اور مطمئن بھی۔ اب
بھی ان سات سالوں میں گاہے سے گاہے سے ان کی یادوں کے چراغ روشن ہوتے رہتے ہیں لوگوں
نے خطیب صاحب کو جیسا تیسا یاد تو رکھ لے سے دنہ اکثر لوگ اسی آرزو میں کہ ان کی بھی
”قدر دانی“ ہو جلتے جی بچھے سے جاتے ہیں۔ ایسے بہت ہیں اور خطیب صاحب ایسے خوش قسمت ہیں
کہ۔۔۔ جب وہ زندہ تھے انہوں نے اپنا لوہا منوالا تھا اب خطیب صاحب ان صاری باتوں سے
بلے تیاز میں لیکن اگر خطیب صاحب کی ضرورت تھی تو سماج کو تھی چہاں آج بھی جہنیز کی لعنت موجود
ہے، جہاں گھر دیں آج بھی کنو اریاں دیٹھی سک رہی ہیں، جہاں آج بھی بھوک، افلاس اور
شکر دیتی نے عوام کی کمر کو توڑ رکھ لے ہے۔ سماج کی آسودگیاں، کمزوریاں اور خرابیاں خطیب صاحب
کی یاد کو محیثہ تازہ رکھیں گی۔ ہم ان کی ضرورت کو بھیتھے محسوس کرتے رہیں گے کہ ایسا تیشہ زن
اب نہم میں نہیں رہا۔۔۔

اُچھے باشتا پھر تا تھا کل تلک جو یہاں سُخن لئے اب وہ انڈھر دیں کی رنگزد میں ہے

ان کے ایک روز ہونے سے مغلیل یا رال اداس ہے اور عقیل شحر سونی سونی سی باشہری ادبی ردنگ مانڈسی پڑگئی ہے اور فلٹر بیڈز کے سوتے جیسے سوکھ گئے ہیں۔ فلٹر بیڈز اہل گلگبرگہ کے لیے ذخیرہ آب اور اہل قلم کے لیے ذخیرہ آب و دانہ تھا۔

خطیب صاحب کا دستِ خوان چینہ اور ذا الفقار کھانوں کے لیے مشہور تھا۔ وہ خود تو براءت نام ہی کھاتے مگر بھان کو بھونس بھونس کر کھلاتے۔ شعریں درد مندی، رکھ رکھاؤ میں دضداری اور کھانے کھلانے میں بھان داری اور عام معاملات میں دلداری خطیب صاحب کی شخصیت کے اوصافِ حمیہ میں شامل تھے۔ شاعری سے ہٹ کر عام گفتگو میں بھی وہ بڑے بذلہ سنج تھے، کھلتے اور سہنے پھولوں کی طرح! مشکفتی اور تازگی مزانج میں تھی۔ اس لیے مخالفوں میں بھی مشاوروں کی طرح روحِ رواں سمجھے جاتے تھے، کہنے کیلئے ہی نہیں واقعی خطیب درد کا رسان تھے وہ واقعی بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔

شخصی لحور میں سیماں خطیب صاحب اپنے مشق بزرگ بیٹے تکلف دوست اور شخص ساتھی کی ضرورت کو یادیشہ محسوس کرتا ہوں۔ اس وقت ان کی یاد بہت آئی تھی جبکہ "دشت کر بلہ" میں "حسین" تھنا تھا۔ اگر وہ ہوتے میرے لیے ڈھال بن جاتے مسینہ پر جو تھے وہ یادیشہ ایسا ہی کرتے تھے۔ اس وقت وہ چپ کیسے رہتے؟ اب ان دو برسوں کی خانشوں کے بعد حرکت میں آیا ہوں تو لگائے اب بھی خطیب صاحب کا وہی ہاتھ میرے کندھے پر ہے جو انہوں نے پہلی بار آردو وال کے درانٹ سے میں رکھا تھا۔ اس ہاتھ کا لمس آج بھی میرے جسم میں گویا حرارت اور حرکت پیدا کر رہا ہے!

ابراہیم جلیس

”وہ ایک مردِ قلت در تھا...!“

یونہ تو ابراہیم جلیس، کامیابی دنیا میں آباد ہے۔ لیکن وہ مولوی احمد حسین سعیدی اور کے مگر ۱۹۲۵ء میں گلبرگہ میں پیدا ہوئے۔ دبیس پھنس کے دن گذارے۔ ابتدائی تعلیم بھی دوپھی حاصل کی اس لئے گلبرگہ والوں کا حق جلیس پر ہے اور یوں بھی کہ جلیس کی ”ساری خدائی“ بھی بستی ہے یعنی گلبرگہ جائے پیدائش ہونے کے علاوہ ان کا سسرال بھی ہے پھر بی۔ اسے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے علیگڑھ گئے۔ علیگڑھ کے حرکی ماحول نے جلیس کی تخلیقی صلاحیتوں کو گنتدی بنایا وہ حیدر آباد کوٹھے تو خاک گلبرگہ کی پاکیزگی اور علیگڑھ کی آب و تاب اس کے اندر موجود تھی اور رفتہ رفتہ وہ حیدر آبادی ثقافت اور ادب سے پکھا اتنے قریب ہو گا کہ جزو لاٹیٹ بیٹھ گئے۔ جلیس کے تذکرے کے بغیر ثقافت اور صفات اور ادب تو کیا خود شہر حیدر آباد کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جلیس نے جب ”زرد چہرے“ پر سپردے ہٹا کر تو خود جلیس کا چہرہ بھی بے نقاب ہو گیا۔ اب وہ ترقی پسندی جنشت سے مشہور ہوئے۔ جلیس کی تحریریں حیدر آبادیوں میں بیکار محبوب رہیں۔ وہ

بے چینی سے جلیس کے افسانوں اور مصاہین کا انتظار کرنے لگتے تھے اسی زمانے میں ابراہیم جلیس نے مشہور کہانی "دومک ایک کہانی" لکھی۔

"دومک ایک کہانی" کی تخلیق سے پہلے اور بعد میں ابراہیم جلیس نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں ان میں سے ہر ایک تخلیق کو خیرت نصیب ہوئی۔ بعضوں پر تو پابندی عائد ہوئی تھی۔ ابراہیم جلیس کی تصانیف میں زرد چہرے، چور بازار، چالیس کر درجہ کاری تکوناد لیں، کچھ غسم جاناں، کچھ غسم دوراں، ترسنگی کی چھاؤں تلے، اہزاد غلام، پبلک سیفی ریزد، اوپر شیر وانی اندر پریشان، نیکی کر رکھانے جا، ایک پیسے کی خاطر، راہیات باتیں، شامل ہیں۔ جلیس کا موضوع بنیادی طور پر سیاست اور ثقافت ہی رہا۔ گرامہز نے بہت سے مزاحیہ مصاہین بھی لکھے ہیں لیکن مصاہین کا موضوع بھی ہمارا معاشرہ ہی ہے بقول احمد ندیم فاسکنی اس کے افانے نیزد آور گولیاں نہیں ہیں وہ ادب کی برف میں لگی ہوئی لمین کی بوتل نہیں سمجھتا۔ وہ ادب کی حقیقت کی منصب کو پہنچاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب جلیس لکھتا ہے تو سارا معاشرہ اس کے قلم کے چلوہ میں چلتا ہوا حکوس ہوتا ہے۔" عغیل احمد جمال نے جلیس کے ادبی مقام کا تعین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ابراہیم جلیس کا شمار اردو کے ان گھنے چنے ادیبوں میں کیا جا سکتا ہے جنہیں سجنیہ اور فکاہیہ دونوں قسم کی تحریر پر پونکا قدمت حاصل ہے جب وہ دومک کی ایک کہانی لکھتا ہے تو بڑے بڑے چانچیے دلوں سے آنسوؤں کے آبشد آبلنے لگتے ہیں اور جب اس کا قلم ترقیت سمجھنے پر ہوتا ہے تو امام ہارڈل کے درد دیوار پر کراہٹ کھیل جاتی ہے جلیس کی دوہری ادبی شخصیت دراصل اس کی اصلی شخصیت کی آئینہ دار ہے وہ ایک خوددار، حساس اور شریف آدمی ہے۔" جلیس کے قلم کی تیزی اور اس کی شرافت نے بہت چلد پاکستانی علقوں میں مقبول بنادیا۔ خصوصاً آخری روزوں میں پاکستانی صحافت کی آبرو بن گیا تھا۔

سیاسی اعتبار سے ان کے درستون بہت بڑھ گئے تھے آفتاب اپنے نقطہ نظر دن پر پہنچ کر یا ایک بد لمیوں میں ہمیشہ کے لئے چھپ گیا۔ جلیس کے طور ہونے اور فقط اخود ن پر پہنچنے کو سمجھا تھا لیکن اس سے پہلے کہ آفتاب اپنی فضیا پا شیور کے بعد نقطہ نظر ال کی طرف بڑھتا ہماری نظر وہ ہمیشہ کے لئے چھپ گیا۔ اس میں جلیس کی مرد اسی وجہ سے بھی بھی خون کے آنسو روالاتی ہے۔

جلیس کی تحقیقات ان کے ذہنی اور قلبی کرب کا نتیجہ ہیں اس لئے ان کی فکاہیہ تحریکیں اتنی بھی بخوبی مشرب ہے۔ دراصل انہوں نے زندگی میں سنتے اور رہنے کے اوقات کو تقسیم کر لیا تھا وہ دن کو سہنے اور رات کو روایا کرنے تھے صوفیوں اور تکفیروں کا انداز بھی یہی ہوا کرتا تھا مجھے یہاں ان لوگوں سے اختلاف ہے جو جلیس کو ریاستی ترقی پسند کر رہے تھے یہیں یار جست پسند ہی حالانکہ اصل میں وہ بنده نواز کے درستہ اٹھا ایک قائد رہتا خود جلیس کو بھی آخری عمر تک یہی مخالف طریقہ رہا وہ ترقی پسند کرنا پھر وہ فرقہ پرسی کے کوئی خیلی گر گیا اور دو ملک ایک کہانی "لکھ کر اس نے اپنی ترقی پسند کی تجدید یکرالی" ایسا نہیں بیشتر مسلمان ترقی پسند کے بارے میں نہیں کہہ سکتا۔ وہ ترقی پسند رہتے ہوئے بھی تکفیر نہ شان رکھتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال مخدوم الحنفی الدین، میر حسن، زینت ساجدہ، عابد علی خاں اور ابراهیم جلیس ہیں۔

"دو ملک ایک کہانی" برصغیر پندرہ پاک کی سیاسی اور ایشیائی دانستاں ہے زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ایک ناماب ادب پارہ ہے جلیس کی دوسری کہانیوں کے مقابلہ میں یہ کہانی جذبات نگاری کی کامیاب کوششی اس وجہ سے بھی ہے کہ اس میں جلیس خود ایک کھار کی حیثیت سے مشریک مغل ہیں۔ جلیس جو نکھل اس کہانی کے راقم ہیں اور اس کا کردار بھی اس وجہ سے ان کے بھرپور کو غیر جانبدارانہ قرار نہیں دے سکتے۔ ان کے فیصلے ایک طرف جانبدار اُ

ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کہانی کی حقیقت یہ ہے کہ اسکے مطابق کے بغیر حیدر آباد کو دیکھا اور کہا نہیں چاہ سکتا۔ یہ کہانی کہانی ہوتی ہوئے بھی حقیقت ہے۔ اس کہانی میں بیویں صدی کے نصف اہل کا حیدر آباد پہنچ کر لیتا ہے تھرا اور ڈوبتا نظر آتی ہے اس لیے میرا خیال ہے ہم حیدر آباد کو جلیں سے الگ کر کے اور جلیں کو حیدر آباد سے الگ کر کے نہ تو دیکھ سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں جلیں اور حیدر آباد ایک سکھ کے دو واضح اور روشن رخ ہیں۔

ڈاکٹر زور

اُن کے کام کرنے کا انداز مفسری تھا

ڈاکٹر غلام نبی الدین قادری زور کا نام ان لوگوں میں نمایاں اور روشن ہے جنہوں نے نہ صرف اردو زبان اور ادب کی خاص خدمت کی بلکہ حیدر آباد کی تہذیب، اشائستھی اور اتحادت، کو رونق بخشی اور حیاتِ تازہ بھی ڈاکٹر زور حیدر آباد کی اس تہذیب کی پیداوار تھے جو اپنی آب و تاب اور سچ دلچسپی کے اعتبار سے ہندوستانیوں کے لئے اپنے اندر مقناطیسیت رکھتی تھی۔ ہماگیر دارالزمان محل کی عیش کو شیان اور دولت کی فراؤ ایام طسماتی ہمایوں کی صورت حیدر آباد کے اندر بھی اور باہر شہر ہو تھی۔ ڈاکٹر زور ۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو جس گھر انہیں آئی تھیں کھولیں وہ ایک سندھی خا نزادہ تھا۔ والد مولانا سید شاہ غلام محمد قادری پیر طریقت تو تھے ہی شتر گو بھی تھے۔ اس طرح حودر کا تحریر مذہب اور ادب کی مٹی سے اٹھا تھا۔ انہوں نے دم واپسیں بھی ادب اور تہذیب کی خدمت انجام دی ہے۔

ڈاکٹر زور کی زندگی کا اگر یہم تجزیے کریں تو اس مردِ قلندر کے یہاں ایک طرح ہی آسودگی شائستھی اور ایک طرح کی پشاشت اور طبائیت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی تعلیم کا سنتہ پاٹھ شالہ، ہمارہ گلی سے شروع ہو کر سورن بورن بینور سٹی پیرس میں ختم ہوتی۔ ڈاکٹر زور نے

لمحہ سماں خری تک مشرق و مغرب سے اپنا رشتہ اس طرح استوار رکھا کہ وہ تمہری بہداخلاق کے اعتبار سے خالص مشرقی اور فکر و عمل کے لحاظ سے سراسر مغربی تھے وہ جب پاٹجامہ شیر و افی زیب تن کرتے اور پانچ باتے تھے تو مشرقی لگتے تھے لیکن ان کے کام کرنے کا انداز مغربی تھا۔ انہوں نے تاہل سے کام نہیں لیا ورنہ وہ ڈھیر ساری کتابوں کے مولف، مرتب اور مصنف کیسے ہوتے، تنقید کے اشارے اور تحقیق کے اجالے کہاں ملتے، گھٹائوپ انہیں سے میں اردو زبان کا چڑاغ یوں روشن کہاں ہوتا۔ ایوانِ اردو کی بنیاد کون رکھتا، اشاعتی پروگرام کی حکیمی کیسے ممکن تھی۔ اگر وہ تاہل برتنے تو ادارہ یوں پروان نہ چڑھتا اور چھر کتھا نہ اپنے خطوطوں اور مطبوعہ کتابوں کی وجہ سے علمی دنیا کا ذخیرہ کیسے بن جاتا۔ سب رس "کس طرح شائع ہوتا ہے اردو زبان دانی کے امتیازات جو منفرد ہو رہے ہیں یہ ان کی محنت شاقہ کا ذخیرہ ہی تھیں۔ پس تو یہ ہے کہ انہوں نے افزاد پر مشتمل ادارہ قائم نہیں کیا تھا وہ اپنے ذات میں ایک ادارہ تھے۔

وہ ادارہ ان محنوں میں بھی تھے کہ ان کے احباب مثل نواب مہدی یار جنگ، نواب یاقوت جنگ، نواب زین یار جنگ، نواب عنایت جنگ، نواب مہدی نواز جنگ، پروفیسر مجید صدیقی، مولوی محامد علی عباسی، مولوی ولدار حسین، جامعی پرشاد، مولوی تھیر الدین ہاشمی، نہندر راج سکینہ، مولوی سید محمد، من راج سکینہ، مولوی اکبر الدین صدیقی، پروفیسر حمید الدین شاہد، ایں این گپتا۔ اور ممتاز ماہر تعلیم مولوی علی اکبر جسید راحد تھے۔ ان میں کبھی دوئی نہیں تھی اور آج بھی نہیں ہے۔ ان میں سے بیشتر کل بھی متبرک تھے اور آج بھی سرگرم عمل ہیں اور ان کی اس گرفتی عمل سے مستقبل تابناک رہے گا اور تابندہ بھی! داکڑ نے ایسے پُر آشوب دور میں ادارہ قائم کیا تھا جبکہ شہر یار دکن کے قدم اپنی زمین چھوڑ چکے تھے اور فلاں نا مغلق تھا۔ نذری بارغ خزان رسیدہ ہوا تو زَدر نے اپنے رقصاء

کے ساتھ اردو زبان، ادب اور تہذیب کی خدمت کا بیڑہ آٹھا یا اور ایوان اردو تعمیر ہوا۔ اس طرح جید ر آبادی تہذیب کا محور و مرکز بدل گیا۔ تحولِ کعبہ کا یہ واقعہ زمانہ کے مزاج کے مطابق تھا جمہوری اور عوامی تھا اس لئے شما اور بھی ہے۔

ڈاکٹر زور نے اہل دکن خصوصاً حیدر آباد کے اہل قلم میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور ان کو کام پر لگانے کے لئے اور پھر دکنی تہذیب کی بازیافت کے لئے قلم گولکنڈہ کے گھنڈروں کی طرف رجوع کیا۔ دکنی اقتدار کی دریافت میں نایاں حصہ لیا اور اس طرح ان کے رشتہ نکر کو بانی سے جوڑ دیا۔ یہ کام اہنوں نے ذاتی طور پر بھی کیا اور پھر ادارہ کی صورت لپنے احباب سے بھی لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل دکن پہلی بار بالا حصہ کی بلندی، مکہ مسجد کے قدس اور چار منیار کی مرکوزیت سے آگاہ داشناہ ہوئے۔

ڈاکٹر زور کا کام تدریس سے کے سر ادارہ کے قیام تک پھیلا ہوا ہے اور اس کا کسر حدود میں کشیر بھی شامل ہے ذاتی طور پر وہ ایک بلند پایہ محقق، زاد و نویں صحف، اور گھری نظر رکھنے والے نقادر تھے۔ ان کے سحر بندی کا نام ان کی عنصرت کے نام ہے۔ اہنوں نے ایک استاد کی حیثیت سے اپنے طالب علموں میں ادبی ذوق پیدا کیا۔ ایک محقق ہونے کے ناطے اپنے احباب کو تحقیق و تدقیق کے رمز و نکات سیکھائے اور اردو تحریک کے سربراہ ہونے کے ناطے نامساعد حالات سے مقابلہ کرنے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ دیا ہے۔ تحقیق کا جرداںستان اہنوں نے کھولا ہے اس کی وجہ سے دکنی تحقیق و ادب دو لغوں ہی کو پرداں چڑھایا اور اس کام سے دکن کے ادباء و شواروں کو خود اعتمادی و خود آگاہی کی دولت سے سرفراز کیا ہے ڈاکٹر زور کا یہ ایسا کارنامہ ہے جسے اہل دکن کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ در نہ ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ تاریخ ادب اردو اہل دکن کے شرکاء نظری کارناموں سے تقریباً بے نیاز رہی ہے۔ یہ کوتاہی، میں ہیں کہتا کسی عجیبت

یا تنگ نظری کا نتیجہ تھی بلکہ اہل ہند اصل میں اہل دکن کے کارناموں سے کوچھ داقیقت
ہنسی رکھتے تھے۔ چنانچہ میر کے تذکرہ سے لے کر اعجاز حسین کی تاریخِ ادب اور دلکش دکن
کے بیشتر دانشور ادیب، شاعر اور نقاد گورنمنٹ گزناں میں رہے ہیں۔ ادھڑہ اکڑہ زور دوڑہ
ان کے دلستان کے محققوں اور نقادوں کی کوشش کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی اہل قلم ہماری
تاریخِ ادب کا حصہ بن سکے ہیں۔ میرے خیال میں ہج تک اردو زبان و ادب کی جتنی
تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ ناممکن اور ادھوری ہیں۔ جمیل جالبی نے اس سلسلہ میں سختن اقدام
کیا ہے اور اردو کی ایک سب سو طبقاتی تاریخِ رقم کی پہے تاہم اس تاریخ میں کرناٹک، ٹامنڈو
اور کیرالا کے ادبیوں اور شاعروں کا ذکر نہیں ہے حالانکہ تاریخی اور ادبی نقطہ نظر سے ہمارا
یہ قابل فخر سرمایہ ہے اور جس کے تذکرہ اور تجزیہ کے بنیاد پر ایک ممکن اور جامع تاریخ کا
تصور نہیں کر سکتے۔ یہ کام گوداکٹر نعید یا ان کے رفقاؤ نے بھی پوری طرح نہیں کیا۔ لیکن
ادارہ ادبیات اردو اس سمت پیش رفت کر سکتا ہے اور یہ کام کرنے کا ہے۔ مجھے
یقین ہے ادارہ ادبیات اردو کے موجودہ اربابِ مجاز اس اہم کام کی طرف توجہ
دیں گے۔ اور اگر یہ کام ہوتا ہے تو اس سے ڈاکٹر زور کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی
ہے۔ میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر زور کو خراجِ تھیں پیش کرنے کا یہاں اندازہ زیادہ سچا ہے
اور موثر بھی ہے!

شمس الامراء ثانی

”عطر کا حکم دیا اور پہلو کا تکمیلہ پال دئے“

امرکے پائیگاہ میں نواب فخر الدین خان کا بڑا نام ہے خطابات میں امیر کبیر اور شمس الامراء زبادہ شہور ہوئے جبکہ ابوالخیر ان کے نام کا جزو بن گیا۔ ان کے خلاوہ امام جج خورشید الدعلہ اور خورشید المکبھی ان کے خطابات ہیں۔ نواب شمس الامراء اول کے استقال کے بعد امیر پائیگاہ کھلائے۔

نواب شمس الامراء ثانی ۱۸۷۵ھ م ۱۸۸۶ء حیدر آباد میاپیدا ہوئے۔ ابھی دس سال ہی کے تھے کہ والد کا استقالہ ہوا۔ آصف جاہ ثانی میر نظام علی خان نے ان کی پرورش کی اور تعلیم کی طرف خاص توجہ دی۔ صاحبزادی شہزادی بھیران نا، بیگم ان سے (۱۸۰۰ء) میں بیا ہی گئی اور دس ہزار سوار کے منصب نے سرفراز فرمایا۔ ۱۸۲۲ء میں امیر کبیر اور شمس الامراء کے خطابات عطا ہوئے۔ بعد ناصر الدولہ آصف جاہ جوہرام مدار المہماںی کے عہدہ پر فائز رہے۔

”وزیر مطلق مشاہد وکن امیر کبیر“

حضرت فیض نے تاریخ کھد سکنی بمذابت رائی نہ دلی۔ صبور کیا حوال دچا

نہ تھا۔ ساؤنسوں کا بازار گرم تھا۔ شخص الامر اور ایسے ذی ہوش اور ذی علم آدمی کے لیے، ایسے پر اگندہ ماحول میں کام کرنا اچھا نہ رکھا اور وزارت چھوڑ کر علم و زبان کے کام میں جوٹ گئے۔ زمانہ کے مزاج اور روایت کے برخلاف دلیوری ہی میں چھاپہ خانہ قائم کیا اور جہاں نمایں رصدگاہ بھی۔ انہیں سائینسی علوم سے غیر معمولی شغف تھا اور جانستہ تھے کہ یہی علم ایسا ہے جو ملک و قوم کی ترقی کا ضامن ہے قیام جامعہ عثمانیہ کے پارے میں مختلف لوگ مختلف امراء، علماء و وزراء کا نام لیتے اور ان کو اس تحریک کا بانی بتاتے ہیں حالانکہ امیر کبیر نے قیام جامعہ عثمانیہ سے تقریباً ایک صدی اُدھر اس جامعہ کی نیورکہ ری تھی اور اس طرح حیدر آباد کے اس امیر کبیر اور نواب ابن نواب نے بیڑ بازی، پتنگ بازی اور دوسری مشتمل اس کی بازیوں سے دُور تعلیمی شعور کو بدلے اور کرنے کا کام شروع کیا۔ شخص الامر اور اصل میں روایت مشکل جاگیر دار ان محسنوں میں تھے کہ انہوں نے اپنے دربار میں دیگر نوابوں کی طرح اپنی مدد اور قصیدہ کے لئے شراو کی ہمت افراد میں کی بلکہ کمال تو یہ کہ انہوں نے شرار اور ادب سے سائینسی کتابوں کے ترجمہ اور تالیف کا کام لیا یہ بات حیدر آباد کے مخصوص جاگیر دار ان ماحول میں بالکل مختلف تھی۔ نواب شخص الامر نے محسوس کیا تھا کہ حیدر آباد میں یہ جو روایتی قعلیم کا سلسلہ چاری ہے وہ اصلاح طلب ہے۔ حیدر آبادی موافرہ خصوصاً جاگیر دار ان ماحول میں جو جہالت عام ہے اور اکثر جاگیر دار فضولیات فحولات اور قویات میں پھنسنے میں ان کو اس ماحول سے بچات دلانے کے لئے تعلیم کا عام کرنا ضروری ہے وہ خود بھی بڑے عالم تھے اور جو دینہ علوم کی اہمیت اور افادیت ان پر درشن تھی اس لئے آپ نے حیدر آباد میں سب سے پہلا سنگی چھاپہ قانے ۱۸۲۶ء میں قائم کیا اور فرانسیسی اور انگریزی زبانوں سے سائینس کے علاوہ ریاضی کی کتابوں کے

ترجمہ اور اشاعت کا کام شروع کیا۔ ۱۸۳۸ء میں پندرہ لاکھ روپے کے صرفہ سے تحریر جہانگی کی تحریر علی میں آئی۔ بلاشبہ ۹۰۰ روپے کا بسیار بڑا مبلغ میں گل کرائٹ نے اردو کہانیوں کے ترجمے کا کام شروع کیا تھا اور اس کی وجہ سے مسجع و متفع زبان کے برخلاف آسان سہیل اور سادہ طرز نگارش کو طرح ملی۔ لیکن شمس الامر اونے اردو زبان کو ہمی فضیلت بخشی اور اسے پہلی مرتبہ گل دببل کے حوال سے نکال کر سائنس اور ریاضتی میں رجوع کیا۔ یہ جو کارنامہ شمس الامر اونے انعام دیا کوئی مجموعی کارنامہ نہ تھا یہ تو ذہن کو بدلتے کام تھا اور کمال تو یہ کہ یہ کام کسی عوامی رہنمایا یا عام عالم اور مصلح قوم نے نہیں بلکہ ہیک امیر کبیر نے انعام دیا۔

بعقول نواب ظہیر الدین خان ”پہلے امیر پائیگاہ ہیں جن کی علم دستی و علم پروردی آج تک مشہور ہے“ ”گلزارِ صفیہ“ کے مؤرخ خواجہ غلام حسین خان زمان نے لکھا ہے۔
 ”نواب ناصر الدین شمس الامر اثاثیل بہت بڑے مصنف اور زبان اردو کے محسن تھے۔“

چنانچہ ان سے سائنس اور ریاضتی کی بہت سی کتابیں منسوب ہیں۔ ان کے مطبع سے میر شمس الدین فیض، مولوی سید علی شاہ، میر امان علی دھلوی، غلام عیی الدین حیدر آبادی مترجموں اور موسیٰ تویس مفتک و مابستہ تھے۔

شمس الامر نے قلمی کتابوں کے ترجمہ کا یہ حد کام کیا وہ اس احساس کے ساتھ تھا کہ اردو زبان اس زلپر علم سے محروم ہے اور یہاں کے لوگ علومِ سائنس و ریاضت سے ناپلبد ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

”اس دا سطہ درت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدہ کے لئے کتاب مختصر، جامع چند علم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جائے۔“

کہ فرماتے تھیں میں اس کی معلومات سے طالب علم کو کچھ فائدہ
میسر ہو جائے۔ ”

کمال یہ کہ اس کام میں انہوں نے اور وہیں اپنوں سے بھی کام لیا۔

چنانچہ فرزندگان میں نواب محمد رفیع الدین خاں مددۃ الملک اور نواب بدرا الدین خاں حنفیۃ الملک
تزمیرہ کے کام میں دلچسپی لینے لگے۔ گویا اس طرح علی کام امراء پر میڈیکاہ کی میراث بن گیا۔
حیدر آباد کی جدید تعلیم کے مختار اور ماہر تعلیم پر ویسی حل اکبر نے شمس الامراء کی ان ہی خدمات
کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

” اس ضمن میں شمس الامراء شان خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو نہ صرف
علم دوست بلکہ عالم بھی تھے۔ یہ ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے کہ انہوں نے
۱۸۲۶ء میں مغربی علوم و فنون یعنی کمیاء، طبیعت، ریاضی اور سینت
کی کتابوں کو انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے کی
بنیاد ڈالی۔ آپ کا قائم کردہ مدرسہ فخریہ میں جس کے پورے اخراجات
کے آپ کھینل تھے ان علوم و فنون کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ یہ

گویا شمس الامراء شان نے جہاں سنگ چھاپہ خانہ کھول کر ”دارالترجمہ“ کی راہ
ہموار کی تھی مدرسہ فخریہ کے قیام اور اردو زبان کو فریجہ تعلیم بنانکر ایک اردوجاہمہ کے قیام
کے لئے بنیاد فراہم کر دی تھی۔ زمانہ شاید اس حقیقت کا اعتراف نہ کر سے یہیں تاریخ نہ
اس سہری حقیقت کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھا ہے۔

یہ سہیں کہ شمس الامراء شان انقلابی ذہن رکھتے تھے اور انہیں حیدر آباد تہذیب
اور معاشرت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی حالانکہ وہ کچھ مصنفوں میں حیدر آبادی تہذیب کے پروردہ
یعنیہ اور نقیب و علم بردار تھی۔ انہیں حیدر آبادی تہذیب سے انس تھا اس لئے اس تہذیب

کی حفاظت کے جتوں بھی کیوں ہیں۔ ان کا مرتبہ مشاہد کرنے کے بعد حیدر آباد میں سب سے پڑا تھا۔ وہ خطا بھی نواب اور جاگیر دار نہیں تھے جاگیر دار اور نواب تو انہیں ترکہ میں بلی صحی خالتوادہ آصفیہ کے وہ قریبی قرابت داروں میں سے تھے اس لئے بھی حیدر آبادی تہذیب ان کے گھر کی اونڈی صحی بلاشبہ حیدر آبادی تہذیب کو قطب شدی تحدن سے تیز کرنے اور مغلی تہذیب سے الگ کرنے میں جہاں شاہان دکن نے اہم حصہ ادا کیا تو انہیں حیدر آباد کے نوابوں اور جاگیر داروں نے بھی اپنا کام کا ہے اس تہذیبی انا اور خود کی تحریک تشکیل میں ماجہر چند وصل، ”نواب شش الامرا و اول“ نواب مختار الملک، ”نواب صرائع جاہ اور سرفقار الامرا“ نے گران قدر حصہ ادا کیا ہے فہاراجہ سرکشن پرشاد کے دور کو پہنچتے پہنچتے یہ تہذیب ایک نئی تہذیب سے مقاوم ہو رہی تھی انگریزی تعلیم اور تہذیب اپنا اثر دکھانے لگتے تھے اس کا احساس بڑی شدت کے ساتھ شخص اللہ اکرم شان کو ہو رہا تھا۔ یہ تبے پہنچی جوان کے قلب دُر ہن میں پیدا ہو گئی تھی اس کا اظہار انہوں نے سردار الملک سر درجنگ سے بھی کیا ہے چنانچہ وہ کارنا مہر سرداری میں رقم طراز یہ۔

”میں ابھی سے دیکھتا ہوں کہ ایک انقلاب عظیم ہونے والا ہے میں چند روز کا نجاح ہوں۔ میں کہاں اور چنور پر نور کی عہد حکومت و مختاری دیکھی کہاں۔ علاوہ اس کے حاضر پاشان در دولت کو جو موقع مرضی محسوس کا ہے وہ ہم کو فیض نہیں۔ صرف تم لوگ نگران حال رہو گے مسلم تھیں لیکن انگریز کا ترقیتی پر اور انگریزی تعلیم کا کیا اپنا اثر دکھانے مختار الملک بہت رانا اور فرداندشیں آدمی ہیں لقول ناصر الدولہ لیکن جو اہم بارہ اور جیسے کا تحریک اہمیت کا ہے مگر انگریزیت

ریلا مثل مسیح اب کون روک سکتا ہے۔ جو امُت ہمارے بعد آئے والی
ہے ہماری وضع ہمارے مراسم سے بے خبر۔ نہیں معلوم کیا منتظر بخچا ہے
بہر حال اس قدر تو ضرور ہے کہ مذہبی خیالات قائم رہیں اور آداب و
شایی میں فرق نہ ہے نے پائے اور مثل تقویم پارینہ یا اساطیر الاولین
چشم دور بیں سے نظر انداز نہ کئے جائیں۔“

یہ فرمائی عذر کا حکم دیا اور پہلو کا تکیہ بھی بدل دیا۔ یہ استارہ تھا کہ برخاست؟
تکیہ کے بد لئے کی دیر تھی کہ تہذیبی اقدار برخاست ہو گئے یعنی عذر کی ٹھیکانہ اور اس مرد
دانی کی آزاد اب بھی خفناک میں بھیلی ہوئی ہے۔ ۱۲۷۹ھ میں شمس الامڑان کا انتقال
ہوا یعنی حیدر آبادی تہذیب کو جو عذر دیا اس کی خوبیوں کی بھی محسوس کی جاسکتی ہے اور
ان کی آزاد کو سنا جاسکتا ہے۔ ہم حیدر آباد کے اس مردِ دانہ مرد پیغمبر کو تقویم پارینہ
نہیں سمجھتے۔ اب بھی ہم نے ان کی یاد کا چراغ روشن رکھا ہے۔

اُصف سالع

شمعِ حرمِ عشق ہوں میں ...

لب بند اور قلمِ شہر سا جاتا ہے بات ہو تو کس کی ہو اور کس انداز میں ہو؛ پیرے
بیانِ عاجز ہے۔ غالباً ہی کا وہ زورِ قلمِ تھا جس کے انداز نے "پیری" کے ذکر کو دل کو دز
اور دل پذیرہ بنادیا تھا۔ وہ قلم تو غالباً کے ساتھ ٹوٹ گیا، ہمارے ساتھ میخت،
یہ ہے کہ ہم نہ تو زورِ قلم رکھتے ہیں اور نہ ہی انداز اپنے دل کی باتِ دلوں میں اُڑھائے اثر
پیدا کر سے! ایک ذاتِ ایسی تھی جو موتیوں سے بھرا سمندر تھی، مگر وہ تاب و توانائی
کہاں کہ غواصی کریں؟ ایک ذاتِ ایسی تھی جو چنان تاروں سے بھری تھی مگر وہ تاب و توانائی کہا
کہ پرداز کریں؟ اور ایک ذاتِ ایسی تھی کہ اس کے حدود میں اور نہ فاصلے مگر وہ تاب و
توانائی کہاں کہ اس کا احاطہ کریں؟ میر عثمان علی خان اسی ذات کا نام ہے اور یہ ذات اپنے
میں سمندر کی گہرائی، آسمان کی بلندی اور کائنات کی وسعت رکھتی تھی۔ ان کی ذات جتنی
گہری، جتنا اُونچی اور جتنا پھیلی ہوئی تھی ان کے کارنا نے بھی ان سے کہیں زیادہ عمیق، گہرے
استھی بلندیوں پا لَا اور اُتنے ہی وسیع اور لاحدہ تھے۔ نواب میر عثمان علی خان کے ان سالے
کارناویں کو فیضِ سحر بری میں لانے کے لئے بلا مبالغہ ایک دفتر چاہئے... یہ باتِ بعض ذات
عقولت اور ذہنی مرجعِ بیت کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ اصل میں مجھے اپنی بے بخدا عقیقی

کا احساس ہو رہا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس آفیلیم اُردو زبان داربند کے اس عظیم بادشاہ نے جو گران قدر اور گران ماہیہ خدمات انجام دیئے ہیں ان کی قدر و قیمت کا صحیح طرد پر اظہار و اعتراف کروں۔ مگر ممکن کہاں؟

نواب میر غوثان علی خان س. ۳۔ ۴۱۸۸۶ ص ۲۷۷ کو پہلی حوالی حیدر آباد میں پیدا ہوئے ۲۷ برس کی عمر میں منڈ فشین ہوئے... سادہ سیدھا بوٹا ساقد، چھریہ بدن، گورا نگ سعمولی سی شیر و انی زیبِ قن کیتے روپی لٹپی اور ٹھیے سعمولی لوگوں کی طرح زندگی بسر ہو رہی ہے مگر کہیں جلال تھا تو آواز میں تھا، مگر جدار ایسی کہ ایوان کا نپ اٹھے اور اگر رعب کہیں تھا تو آنکھوں میں تھا، چمکدار ایسی کہ کوئی تاب نہ لاسکے! وہ شخص ایسا تھا خود تو یہت سعمولی غذا کھاتا تھا لیکن خوان تھے کہ مزے دار کھانوں سے بھرے دوسروں کے لئے ہوتے تھے خود تو سعمولی بہاس زیبِ قن کرتا مگر اور دوں کے لئے زرق برق کے بہاس فہیا تھے۔ وہ اپنی ذات پر ایک پیسہ نہ خرچتا مگر خزانہ کا منہ رعایا کے لئے کھلا تھا۔ دو اخانوں کی عمارتیں ان ہی کے زمانے میں بنیں۔ عدالت العالیہ کا سنگ بنیاراہنون نے ہمارکھا، کتب فخار، آصفیہ کی کتابوں کو انھوں ہی نے جمع کیا، اور تعلیم کو اس طرح عام کیا کہ رعایانے ان کے تجھ علمی اور علمی خدمات کے پیش نظر سلطان العلوم کی سند عطا کی۔ جامعہ فتحانیہ کی سنگ بستہ عمارت تیار ہوئی تو خوشی خوشی مادر علمیہ کے افتتاح کے لئے پہنچے۔ اس جامعہ میں اس وقت کے مطلع اعیان بادشاہ کے عہد میں اُردو کے ساتھ ساتھ علاقائی اور میں الاقوای زبانوں کو کبھی فروع حاصل ہوا۔ اس نے کبھی کہا تھا۔

”میری نظر میں نہ کوئی قوم بلند و پست ہے اور نہ کوئی اچھوتہ ہے جب تک وہ نیک کردار کی حامل ہے۔ بلکہ میں سب کو بیکھیت بنی نوع“

”ایک طرح سے برابر بھتائی ہوں!“

کی طرح فرم دنارک ہے۔ اس عمارت کے پھرول سے کل بھی انکاں نور ہوتا تھا اور آج بھی روشنی پھوٹتی ہے اور آنے والی صدیوں کو یہ پوں ہی روشن کرتی رہے گی۔

جامعہ عثمانیہ حض ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں ہے، یہ تہذیب و تمدن کا مودن معقل و ادراک کا سرچشمہ اور تغیر و انقلاب کا منبع بھی ہے۔ یہاں کے تربیت یافتہ نوجوان لمح یقیناً عالمی مشہرت رکھتے ہیں اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں اس مادر علمیہ کے سپورٹز نے اپنا گرمی فکر سے حیاتِ تازہ نہ بخشی ہو۔ خود قوی سطح پر ایسی بے شمار شخصیات تھیں اور آج بھی موجود ہیں جن کی صلاحیتوں سے ہم مستفید ہو رہے ہیں میں سلاست، صحفت، ادب، تہذیب اور مذہب کے میدانوں میں فکر و خیال کے چراغ روشن ہو گئے تو ان چراغوں کو خون بھگر دینے والوں میں یہی پیش پیش رہے ہیں آزاری سے قبل ایک کارروائی تھا جو جانبِ منزل روان دوان دھتا اور اس کارروائی میں مختلف الخیال افزاد شامل تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو آزاد حیدر آباد کا لخڑ بلند کر رہے تھے، وہ بھی جو آزاد ہند میں حیدر آباد کے انعام کو ترجیح دیتے تھے اور ان میں وہ بھی تھے جو حیدر آباد کے شاہ سیر عثمان علی خاں کو مسلمانانِ دکن کے اقتدار کا منظہر سمجھتے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو ہاتھ میں تلوار نہ ہونے کے باوجود میدانِ جنگ میں لڑتے تھے اور وہ بھی جن کی مصلحت پسندی اور حکمت عملی عقدہ سیاست کو کھو لئے میں معروف تھی۔ ملک کی آزاری انہیں عزیز تھی! یہ لوگ جب میدانِ عمل میں ہوتے تو اختلاف کرتے تھے لیکن جب ملتے تھے تو شیر و شکر تھے وہ اپنے گھروں میں ہندو تھے، مسلمان تھے، سکھ تھے اور پارسی بھی تھے لیکن گھروں کے باہر رہ بھائی بھائی تھے۔ تھے کیوں کھروں؟ آج بھی یہیں! جامعہ عثمانیہ کی روایت آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔ یقیناً شخص ہم میں نہ رہا جس نے بجت کو بنیاد کا پھر بنا کر جامعہ عثمانیہ

ثبوت پریش کیا۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے اپنی ذاتی اور خلافانہ صدای حیتوں کا شعر گوئی اور نشرنگاری کے ذریعے ثبوت پھیل دیا۔ وہ خود بھی بڑے شاعر تھے اور عثمان سخنخواست مخلص فرماتے تھے وہ سلطان الحدوم تو تھے ہی اپنی شاعر آزاد خوبیوں کی وجہ سے "خسرو شریں سخن" بھی کہلاتے۔ بقول

ہمارا چہرہ شکر سے

یہ اگر کہ آئندہ صورتِ جاناب ہوتا

لاکھ میں ایک ہمارا دلِ حیران ہوتا

"اعلم حضرت نے پہلے ہی تاسخ کی غزل سے ابتداء کی" وہ بلاشبہ استاد عجیل کے شاگرد

تھے مگر شحر اپنے رنگ میں کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔

سامنے تیرے میں سب طفیل دیستانِ جنوں

تمیں ہو، زانٹ ہو، یا فرہاد، عثمان کوئی ہو

اکھر غم، جاہ ساریع کی نشر پرے تکلف، روان اور مزہ دے جانے والی ہوتی تھی۔

"نذری بارع" سے جو ارشادات "فرمایا" کے ساتھ جاری ہوتے تھے وہ اپنے میں بڑی انفزادیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک ایسا طرزِ لگارش اختیار کیا تھا جو ان کا ایجاد کردہ تھا اور جو ان کی ذاتِ مشاہدہ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ کویا اپنی طرزِ لگارش کے دری ہو جد بھی تھے اور خاتم بھی۔ اصل میں سلطان الحدوم آصف جاہ ساریع کی نشران کی ذات ہی کی طرح سادہ مگر پُر کار تھی اور انہیں انفزادیت جملکتی تھی۔

میرے لیئے، جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ حضرت آصف جاہ ساریع کے کارنامول

کا احاطہ ممکن نہیں ہے جیسے جیسے زمانہ نگزرتا جائے گا ان کے کارنامے رکشن

نہ ہوتے جائیں گے۔

شمع حرمِ عشق ہوں میں صونتہ جب گرے ۔ ۔ عینک بمحاجہ کے گل نہ ہار دھسے نہیں

سقوطِ حیدر شاہ (۴۱۹۵۷) کے بعد وہ بادشاہ سے راج پر نکلے ہیں اور تنظیمِ جدید (۴۱۹۵۶) کے بعد ان کی دنیا "نذری باغ" میں سمٹ گئی۔ ۴۱۹۶۲ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کا جنازہ اس دھرم سے اٹھا کر دنیا انگشت پہ نندال رہ گئی۔ ان کے انتقال کی خبر جلیسی ہی "بلدہ" اور "اطرافِ بلدہ" پھیلی تو اس مردِ قلندر کا آخری دیوار کرنے والوں میں ایک میں بھی شامل تھا۔

پھر صدمہ فراق کا دل پر اثر ہوا

پھر آنابِ داع جگر جلوہ گر ہوا

جلوں جہازہ میں مشترکت کرنے والوں کی تعداد ہزاروں تھیں لاکھوں میں تھی جب مسجدِ حبوبی میں پردِ نحر کیا گیا تو "شاہ غوثاں" کی دلوں آنکھیں "بے اختیار رہیں" جلوں کا سیلاب تھا کہ روان تھا، تھتا ہی نہ تھا۔

گل در سکان و سبل سب خزان میں ہو گئے رخصت
مگر بیبل کے لب پر رہ گئی آہ و فخار باقی ہے۔



(میر سعید عین مقالہ "عہد احمدیہ میں اردنبر نگاری" کا ارتقاء سے مانوذ)

۔ فظ بے لفظ ...

کتنی فرخندرہ ہے شب

(۱۳ جولائی ۱۹۶۹ء کی ایک اسات)

آج رات طبیعت کچھ اگتا سی گھنی تھی۔ جلد ہی بستر پر لیٹ گیا، نیند کی حالت میں ایسا لگا کہ کوئی کانوں میں رس گھل رہا ہے۔ دماغ مسٹر ہو گیا اور دل میں بیبھی کیفیت و انہماط کے احساس سے بے چینی ہوئے تھی، بیدار ہو گیا، جس مکان میں قیام کرتا ہوں بالکل میر سکرے کے پشت پر چند جھونپڑیاں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے انسان گھردئے افیلے مٹی پر کے کچھ مکان اور ان گھرنہمیں چھوٹے چھوٹے غریب انساں۔ انہاس غربت جہالت اور تنگ دستی نے بڑا حال بنادیے رکھا ہے، راستہ سے گزرتا ہوں تو ناک پہ کپڑا رکھ کر یہیں اب بھی اہنی گھروندوں سے چھوٹے چھوٹے انسانوں کی گھروں سے ڈھولک کی آوازیں دل میں پھیل سی چماری ہیں۔ کانوں میں ان ہی ضریب اور مجبور عورتوں کی سحرائیز آوازیں پہنچ رہی ہیں اور کانوں کی راہ دماغ پر بھی اور دل پر عجیب درزیں پھانٹالی رہی ہیں۔ میں بے چین ہوں، مصطفیٰ بھی۔ ماٹھی کی عظمت کا احساس جاگ رہا ہے۔ ماٹھی کے دو گوں کی عظمت، ان کی بزرگی، بڑائی، ان کے خیالات کی پاکیزگی، تقدیس۔ ان کے دلوں کے اندر موجود مجت کا سیلانہ، ان کی آنکھوں کی چمک، دل کی رھنمیں، ان کے سماں کے بندھن، مصنفوں، استوار اولہ

دیر پا۔ نسب کچھ ان آوازوں، لوک گیتوں میں محسوس بھی اور عین محض ملکہ پر موجود ہیں۔ لوک گیت سماجی بھی ہیں اور مذہبی و اخلاقی بھی۔ کس طرح ان لوگوں نے گفت کاروں نے ایک عام انسان کے ذہن کی تغیر کے لئے، قلب کی تشکیل کے لئے بھی کسی اچھی اچھی ہاتھ کہے گئے ہیں ان چھوٹے چھوٹے لوگوں، غور توں کے منہ سے اتنی بلند، پاکیزہ اور حیات آفرینیں باتیں سن کر یقین ہوتا ہے ایک دن یقیناً آج کا یہ چھوٹا پستہ قدام انسان عظیم کہا دے گا۔ چاند پر باس نے کندہ کو پھینک دیا اور چاند کج اپنی بے خانگاں، برپادی اور دیران کے ماں کو ہمارے صافے عربان ہو چکا۔ شاید اب یہی انسان انہی لوگ گیتوں سے نیو قوت اور طاقت بھی حاصل کر کے ستاروں سے آگئے شے جہاں کی تلاش میں نکل پڑے۔ ان گیتوں سے حوصلوں کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے اور دلوں کے اندر چھپے ہتھیں جذبہ محبت کا بھی پتہ چلتا ہے علم فہم انداز میں، سائنس کی زبان میں محبت بھروسے گفت خاصہ کی چیز ہیں، روشنی اور روزی پھر بھی ارزش ہیں، مستے، چنگے داموں مل جاتے ہیں۔ حقیقی محبت، سچی محبت اور بے بوث محبت، آج کے بازارِ زندگی میں کہاں؟ ان لوک گیتوں میں ابھی کی اسی محبت کا احساس ہونا ہے غیب، بالکل عجیب گلکھے کہ ان گیتوں کے لئے تحقیق کاروں نے کس طرح اپنی محبت کو محفوظ کر دیا اور جاتے ہے آنے والی نسل کو اسی محبت کا درس دے گئے۔ یہی درس عظیم سرمایہ ہے، بیش ہا دولت! جب تک یہ گفت ہیں اور ان گیتوں کو جب تک ہم اپنی شیر میں، لطیف اور پاکیزہ زبان سے گاتے رہیں گے محبت کے موقع روشن رہیں گے ان ان تقدیس کا احساس باقی رہے گا، حوصلے بلند تر رہیں گے، چاند پر ہمارے قدموں کے نشان گھرے ہوتے رہیں گے، مریخ و عطارد اور زندہ بھی ہمارے درستِ رس سے دور نہیں رہ سکتے!

ان بھی گیتوں نے انسان کے دل میں چاند پر پہنچنے کے جذبہ کو پیدا کیا تھا۔ تازہ پہنچا رکھا اور وہی پڑبر جو کبھی خواب تھا آج حقیقت بن گیا۔ میں کہتا ہوں ان گیتوں کو ہام ہونا پاہیزہ تاکہ

نیہ حوصلہ عام ہو، جذبہ عام ہو اور اس لئے بھی کہ تعمیقی محبت اور محبت کے لطیف احساسات بھی اور جذبہ بات زندہ و باقی رہیں۔ کیونکہ یہی جذبات لطیف زندگی کی کائنات کو دوسرے کر سکتے ہیں۔ ان ان رسمگی پاک ہوگی، میرا اور مزین !!

آج کی رات مجھے وہ نارت یاد آرہی ہے جو سرد تھی انتہائی سرد اور ہمہ کی سردیوں کی رات، جاگری (لپ. پ) کے اسٹیشن پر یہی مرتبہ رات کے کوئی تین چار بجے ہے پہنچا تھا۔ اسٹیشن مانٹر کی ہر بانی اس نے اپنے کمرے میں وکر دیا تھی سونے کے لئے۔ گھنڈ دیرا ہو گھنڈ کرو ٹھیں بدلتا اور سردی کا مقابہ کرتا رہا لیکن کوئی پانچ بجے جب کہ خیند کا غلبہ بھجو، تھا اور سردیوں کا روشنگھنڈ ہٹھرا کر دینے والا احساس بھی۔ کالزوں میں اسی قسم کی سحر انگیز آوازیں ہی پھیلیں۔ چند دور تریں پہنچتے کارہی فہیں چوں کہ گیتوں میں اور زبان کے الفاظ بھی بہتر بتے اس عالم ہورہے تھے تھیں ٹھیک ہود پر سمجھنے نہیں پا رہا تھا لیکن آواز نے وہی جاری اثر کیا، پسے چینی ہو گیا معلوم نہیں ان گیتوں کے ساتھ۔ ماہنی کا خیال کیوں آتا ہے۔ ماہنی کے دو گوں کی بحث تکید بنا گی جاتی ہے ان کے تقدیس کا احساس کیوں ہے۔ وہ کیوں یاد آستے ہیں اتنی شدت سے، آنکھوں میں آنسو امڑ آستے ہیں، دل تڑپ جاتا ہے کیوں؟ آخر کیوں؟۔ آخر کیوں؟۔ وہ تجھے آواز بند ہو گئی، ڈھونک کے کی آواز بھی جوانانی انسوانی آواز کا جزو ہیں حیپکی ہے۔ تین کی تھا پوچھا میں ماہنی کی تاریخ پوچھیا ہے۔ وہ آواز بھی رات کے سناٹے میں ہو گئی۔ شاید وہ لوگ بھی تو کسی گفتگو میں نہیں تھے۔

مارا عالم سوچ کا ہے، رات کے سناٹے میں یہاں اور تیناٹکتے کا بیلا ہجونک رہا ہے، یہ نہ ہو سکے۔

کھارات کا سناٹا بڑھتا جائے گا۔ خوف، ہر اس، ادا کا احساس ہو تاہم دل بھر کی تھی۔

ماندی دنیا نیت کے آغوشی میں ہے۔ اب قبرہ لا بجے ہیں، ۱۲ بجے تو رات کا شبیاب ہوا لیکن رات ڈھلے گی۔ سناٹا چھٹے ٹھٹھا جوں جوں وقت گزرے گا ان ان آنکھیں مٹتے اُنھے کا سحر ہو گی۔ انہیں پیسے گما بھرے دنیا جاؤ جائے گی، وہ صرف فیض، دری کام کا جیکل شاپ

صحیح ہونے ہونے تک سچ کا یہ انسان کسی نئی دنیا کا پتہ چلا لے۔ مشاپد ان نیت کے لئے کوئی نیاد رس بھی اور نیا سبق بھی رے۔ مجت، صلح، هشمتی اور بھائی چارگی کا۔ کل تک دنیا بھی ہوئی تھی، اس سوچتا ہوں شمال میں اور اب جزو ہے، میں سُنے گئے گلیتوں نے میرے قلب و ذہن پر جوازات مرتب کئے ہیں وہ یکسان ہیں ہم ایک سے ! اس لئے دنیا کی دحدت پر میرا الیقان سہی، دنیا کے لئے یہیں ایک اور ایک رہا گے۔

ایک بہتر، ایک بہتر میں میں کی پہک، تو قع کے علاقوں پھر اپنے! اسی پر جزا ہا۔

جذبات سے بے قابو ہو گیا۔ ابترے اٹھ بیٹھا۔۔۔ آپ کی یاد آئی۔۔۔ خیالاتِ ملمبند کیا۔ جانتا ہوں آپ دن کی روشنی یہ ششیں کی داستانِ شش رہی ہیں اور دیسے بھی میرے قلم میں اتنا اثر بھی نہیں وہ میرے احساسات کی بھی، اور جذبات کی صحیح ترجمانی کیسے اور وہی اثر آپ کے ذہن و ذلب پر بھی مرتشم کوئے جنم بھرے شکی بعد دہن پرستھی۔۔۔

شش بہ خیر میسے !

بُوئے

روزنامہ "سیاست" (حیدر آباد) کی خبر تھی،
"حیدر آباد ۲۳ اپریل جناب حبیب اللہ آدم (پاکستان) نے تھریا
بہ سال بعد اپنی مادر علمیہ کے باب الداخلہ کا بوسہ لیا..."

اس خبر کے پڑھنے سے مجھے ایسا گھویا ایک نسل نے مادر علمیہ جامعہ عثمانیہ کے
باب الداخلہ کا بوسہ لیا ہے دہ نسل جو ازادی سے قبل اس مادر علمیہ کی گورنمنٹ پر درش
پائی۔ زلیور علم سے آرائستہ ہوئی، عقل و خرد کی راہ سے گذر کر عشق و مسی کے مظلوم سگزدہ
اور ایک سیل روای کی صورت سماج کی شکست و رنجت میں اپنا حصہ ادا کیا ہے اسی نسل
کے لوگوں میں جیخون نے کارہائے نمایاں نجام دیئے ہیں اور اپنا ادر اپنی مادر علمیہ کا نام رکھن
کیا ہے معین الدین قربی، ڈاکٹر حمی الدین قادری زور، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر
غلام دستگیر رشد، پیر حسن الدین، شعیب اللہ، دقا راحمد، حبیب اللہ درشدی، عاقل
علی خاں، حفیظہ قیتل، مبارز الدین رفت، جلال الدین اشک، فلام احمد آرتم۔ اکبر رفاقانی
محمد امیر، عبد القیوم خاں باقی، بدر الدین بدر، لفڑا شدیری، حسین زیبا، محمد رضا نیشاز

مہندر راج سکینہ، منوہر راج سکینہ، رمن راج سکینہ، بدر شکیب، بنی الجی شجیم، شنکر
موہن لال، شنکر جی، سکندر علی و تجد، ظفر الحسن، ہاشم علی اختر، جگن موہن ریڈی،
حسن الدین احمد، محمد مسیمی الدین، میر حسن، اشراق حسین، ڈاکٹر راج بھادر گور، عابد علیخان
محبوب حسین جگر، حمید الدین شاہد، میکسٹر اور ڈاکٹر زینت ساجدہ کے علاوہ جبیب اللہ
آدم مجھی شامل ہیں۔

جامعہ عثمانیہ اور یونیورسٹی کے ایک دیسیع علاقہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے
جہاں کبھی مرہ لقا بلائی چند اکٹھو بھروسہ تی جادوجگاتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک سجلی کی طرح
تڑپتی اور ترڑپتی تھی اور جس کی آواز کے سہر نے فضاؤں کو نغمہ ریز بنا دیا تھا اب اس جگہ
جامعہ عثمانیہ کی درس گاہیں ماہ و رات بھیلی ہوئی ہیں۔ سلطان العلوم حضرت
آصف ساربع کی علم دوستی اور علم پیداواری نے ایک کھلکشاں یہاں سجائی ہے۔ درس گاہوں کے
علاوہ اقامی عمارتیں، بوڈھانیکل گارڈن، کیل کے میدان اور پھر ان سب میں ہر قسم کا لمح
کی عمارت، سنگ خارہ سے بنی، بھی سرائے ہے، وہیں دل پھیلاتے، دوجوالوں کو دھوت
علم دعل دے رہی ہے۔ اس درس گاہ کو دیکھنے سے لگتا ہے پھر بہل آنے کو ہے۔ فلمہت جہل
ذبوں کا فور میونے کو ہے۔ یک لفڑی ادبار و نیکیت دور ہوئی جائے گی، کشت زاروں کے
نشان اب باقی نہ رہیں گے اور لگتا ہے ہر ذرہ رشک، آفتاں، عظمت ملک دکن بے نقہ
ہوا چاہتی ہے اور بقول زور ہے

جامعہ عثمانیہ اب جلوہ گاہ طور پر ہے

ہر طرف پر تو نگن علم دعل کا نور ہے

کتنی بلند، کتنی در خندہ اور کتنی کشادہ عمارت ہے یہ! اس میں بسی خوشبوذ ہیں
کو معطر اور قلب کو عطر بیز کرنے کے ہے۔ گویا پھر سے بنی عمارت ہے لیکن اس کا دل موم

وہ تاریخی جملے جو کسی بھی عالمی دستور اور نظام حیات کا روشن اصول قرار دینے
جا سکتے ہیں۔ وہ جملے کیا ہیں؟ ملا حظہ ہلوں۔

”بھیثت رئیس ہیں ایک دوسرا مذہب بھی رکھتا ہوں جس کو صلح نہیں کے
نام سے موصوم کیا جاتا ہے کیونکہ میرے زیر سایہ مختلف مذاہب و فرقہ
کے لوگ پستے ہیں اور ان کے معاہد کی شکھداشت میرے آئین سلطنت کا
ایک زمانہ سے دلپڑہ رہا ہے۔“

جو کہا گیا وہ کر کے دکھایا گیا۔ یہ صرف کاغذ کے چھوٹ لہیں تھے کہ دیکھنے پر خوبصورت
تو ہیں لیکن خوبصورت نام دشان ہیں۔ سلطین حیدر آباد کی اس مشاہی رواداری اور
شاہ عثمان کی دلداری اور صقداری نے چہارا جہ کش پرشاد سے کہلوا یا تھا:

”جب سے اس مشرق الائوار خسر دکن نے اپنی حکومت کی بسم اللہ کی اور
اس میں جشنِ شاہانہ کی رسم ادا ہوئیں دکن کے لفیب جا گے۔ بہار سلطنت
نے چھوٹ برس سے اور چرخِ نیلی نے تارے اُتارے۔ نفل اللہ کا اقبال چتر
بن کر سایہ قلگن ہوا۔ عزت دجلال کے چلو میں ترقی کی رفتار نے برق خرامی کی۔
بخت آصف کا شہیاذ ہوا اے ملک رانیں پرداز ہوا۔ زمام سلطنت کو
لپٹے ہاتھ ہیں لے کر ثابت کر دیا کہ

بالائے سرشن زھو ٹھندی
می تافت ستارہ بلندی

حضرت میر عثمان علی خاں آصف جاہ سالیع نے بلاشبہ اپنی ناموری کے لئے ”فیض کے
بے شمار اسہاب“ بنائے، پل دتاب بنائے، علمی درس گاہوں کا کھوکھلا، کتب خانے
قام ہوئے اور دو اخانے دسرائے بھی بنئے اور اس طرح ایک رعایا پر در حاکم ہونے والے

کے استحکام کی ضمانت دی تھی اور جس کی دو آنکھیں، ایک ہندو اور دوسری مسلمان کہلاتی
تھیں وہ شخص آج بھی زندہ ہے اور اس کی دو دلنوں آنکھیں چک رہی ہیں آج بھی
لوئیت راؤ کی دی سی۔ لاج میں جیب اللہ آنہج کا نیر مقدم ہو رہا ہے۔ محبت زندہ ہے
اور یہ محبت زندہ رہے گی۔ جب تک جامعہ عثمانیہ کی یہ عمارت ارضِ دکن پر موجود ہے محبت
کی یہ روشنی یوں ہی چھیلتی رہے گی اِسلام بُلتار ہے گا، عمل کی جوانان گاہ سرد و گرم
سے گزرتی رہے گی، عقول و ادراک کے چشمے پھوٹتے رہیں گے اور محنت کا جام چھکلتا ہے
گا۔ لوئیت راؤ اور آج دو افراد کے نام نہیں ہیں یہ دو علمائیں ہیں محدثہ تہذیب کی،
پیار و مستی کی، اور عشق و حبوب کی! یہ دونام! نام نہیں ہیں یہ تو سلطان العلوم کی دو
آنکھیں ہیں، ایک ہندو دوسری مسلمان یہ آنکھیں کل روشن تھیں۔ آج بھی رکش ہیں
اور کل بھی روشن رہیں گی۔ یہ آنکھیں آج بھی جامعہ عثمانیہ کے ایک ایک پتھر ہیں پیوسٹ ہیں
اوہ یہی آنکھیں جامعہ عثمانیہ کی تحریک بھی ہیں۔ یہ آنکھیں آرٹس کالج کی بلند و بالا کالزوں اور
اوپنی اوپنی دیواروں ہی میں پیوسٹ نہیں ہیں بلکہ یہ آنکھیں باب الدا خلہ کی چوکھ پر
بھی لگی ہیں اور آج نے انہیں آنکھوں کا بو سہ لیا ہے انہوں نے بو سہ لے کر حفظ اپنی
عقیدت کا اظہار بھی نہیں کیا ہے بلکہ مادر علمیہ سے اپنے رشتہ کی تجدید بھی کی ہے اس
بو سہ نے ثابت کیا ہے کہ ماہ و سال کی گرد محبت کے جذبہ کو دھندا نہیں سکتی۔
سماستِ حکمت کی لکھریں جو زمین پر کھینچتی جاتی ہیں وہ بڑی کم زد، کم عیار اور بڑی کم محبت
ہوتی ہیں۔ یہ لکھریں زمین کو تو تقسیم کر سکتی ہیں، دلوں کو تقسیم نہیں کر سکتیں۔ لوئیت راؤ
نے آج کو دی سی۔ لاج بلا کفر در واحد کی عزت افزائی نہیں کی ہے بلکہ ثابت کیا ہے
کہ دوسری آنکھیں آج بھی زندہ، تابندہ اور روشن ہیں۔

”یہ“ اپنی نسل کا ایک فرد اس جگہ کو بو سہ دیتا ہوں جہاں جیب اللہ آنہج

کے لب جامہ عثمانیہ کے باب الدا خلہ پر نقش ہو گئے ہیں! یہ مخفی اس لئے ہی نہیں کہ آج کی طرح ہر بھی چند باتی ہوں، ان ہی کی طرح اپنی مادر علمیہ سے بے پناہ محبت رکھتا ہوں، یہ مخفی اس لئے بھی نہیں کہ آج اور ان کی نسل کی طرح میں اور میری نسل اس پھر کی عمارت سے جذباتی و ابتنی رکھتے ہیں اور اس لئے بھی نہیں کہ میں نے اپنے ماخزاں سے ان پھولوں پر عشق و جذب کے نقوش اچھارے ہیں اور اپنے دل کی در ط کنگ کو ان میں سود دیا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ میں اور میری نسل نے یہاں پہاڑیں دیکھتی کا، پھر محبت کا درس لیا ہے، ہم نے احترامِ ادبیت کا درس یہیں سے لیا ہے۔ مجھے خواز ہے کہ بھاری نسل میں نو نیت، راولہد آج زندہ باقی ہیں اور میں آنے والی نسلوں سے پڑا سید ہوں کہ وہ مادر علمیہ کی اس دیرینہ اور مقدس روایت کے پیش نظر محبت کے جذبہ کو تردیازہ اور روشنِ رتابناک رکھیں گی۔ یقینی میکش ہے

مری حرمِ آرزو میں یاس کا گزر رہیں
بہار بے خزاں ہوں میں خزاں کا مجھ کو نہیں

حُسْنی سرور

جیسے بارہ صبا کا جھونکا ہو

۱۴ اگسٹ سمبر کی ایک سرد صبح آلام رام بجا۔

بے صینی سے آٹھ بیٹھا۔ کوئی سارے چار بجھے والے تھے۔ لیکن سرودی کی وجہ سے میرے تو ابھی بارہ ہی نج رہے تھے۔ اتنی سردا راتیں شاید ہی انگرگہ کی قسم میں کبھی آئی ہوں ہی نہ کیا دھوتا، منہ دھونے کے لزام کا مرکب ہوا۔ پیلوں پہن اور کوٹ اور چڑھے جلدی جلدی اسٹیشن کی طرف پل پڑا۔ الیوانِ شاہی کا لوٹی، بس استانڈ اور ریلوے اسٹیشن اڑوسی پڑو سی ہیں اسی نئے بس استانڈ پہنچتے دیر نہ لگی۔ اور اس سے بھی کم وقت میں بس بھی نادھری میں پہنچا اور ہر بس۔ اور پھر انپی بے بس کا عالم نہ پوچھنیے نظر جس چہرہ کو ڈھونڈ رہی تھی گویا وہ خود میرے چہرو کا حتلاشی تھا۔ کیونکہ بس میں حُسْنی سرور کے علاوہ ان کے مشہر خیل اشد اور چھوٹے صاحبزادہ اکمل مہاں بھی اپنی آنکھیں ہاہر نکالے میری تھاں کر دے رہے تھے۔ تسلک راتا ہوا میں آگے پڑھا۔ خیل صاحب پہنچے ہوئے۔

نجیے طبیب انفار کی تھتے ہیں۔

میر نے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ اتنے میں حُسْنی سرور بھی قریب آچکی تھیں اور انہیں کھڑے مجھے تک رہا تھا۔ خلیل صاحب اور حُسْنی سرور کے چہروں پر اطمینان اور خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انہیں ایسا محسوس ہوا گویا اجنبی شہر میں ان کا اپنا کوئی مل گیا ہو۔ اور پھر آٹوکا لی گئی۔ اسی میں ایسا ساتھ کالونی کی پڑیں ہے کون اپنے وقار فضار کو چھیرتے پھاڑتے ہم اپنے کوارٹر پہنچے۔ یہاں سمجھو پہلے ہی سے ہماری منتظر تھیں۔ سیڑھیاں لٹھے کر کے ڈرائیور میں آگئے اور باقی ہونے لگیں تو صدیوں کی اجلیت منہ تکی رہ گئی!

”اپھا! اب آپ لوگ ڈروم میں آرام کریں۔ ہم اپنا کام کریں گے۔

میر نے حُسْنی سرور سے کہا۔

خود سے سے تکلف کے بعد وہ راضی ہو گئیں اور خلیل صاحب تو گویا پہلے ہی سے اس بات کا انتظار کر رہے تھے تھوڑی دیر کے بعد وہ ڈروم میں آرام کر رہے تھے اور... ہم دونوں ڈرائیور میں بیٹھے بیٹھے سورج کی سُرخ سُرخ گھر نوں کو جو آسمان کا سینہ چیر کر ٹلوڑ ہو رہی تھیں دیکھ رہے تھے اور پھر فی چیل گئی۔ روشنی ہی روشنی۔ آجا لا ہی آجا لا!۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ محمد میاں تشریف لائے۔

پُرچھا۔ ”کیا وہ لوگ آگئے۔؟“

میر نے اثبات میں سر ہلا کیا۔ اور پھر دوسرے دن منعقد ہونے والے خیر مقدمہ جلسہ کے دعوت نامہ لئے صدر کی تلاش میں نکل پڑے۔ ہوا یوں تھا کہ حُسْنی سرور کا خط

ایک بھی دن پہلے ملا تھا۔ دوسرے دن رہ واپس ہونے والی تھیں۔ محمود خاوردی نے لکھا تھا کہ حُسْنی سرور گلبرگہ آٹھ تو نیز مرقدی جلسہ ہو۔ دیسے بھی یہ گلبرگہ کے ادب دوستوں، ادیبوں اور مشہدوں کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی لہان باہر سے آ جاتا ہے اس کو خود پر مقدم بھکر کر اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے بھی اسی عادت کے باعث حُسْنی سرور کے خیر مقدم کا اہتمام کیا۔ اور اس اہتمام میں سلیمان خطیب کا اصرار اور مشورے بھی شامل تھے جیسے ہی حُسْنی سرور کا خط ملا۔ میں نے اور سلیمان خطیب نے غالباً کارڈ کا لیب کر دیا۔ غالب کردہ ان دلوں گلبرگہ میں ادبی و منظری محفوظوں کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے۔ ہماری نو تعلیمیں شدہ انجمن "حکملہ" کی سرگرمیاں ہی رومنی فضوار کی رہن تھیں۔ گلبرگہ جسے قلت آب کی وجہ سے ہندگیر شہرت حاصل ہے میں غالباً کارڈ کا مہکتا گارڈن ایک دوسری ہی دنیا میں لے جاتا ہے اکثر تھائیے اور عصرانے میں ترتیب دیئے جاتے ہیں اور جلوسوں کا انعقاد بھی عمل میں ہتا ہے دو روپہ کھڑک سرود میں کے درختوں اور ہر سے مجرے پوتوں کے درمیان میں سے میں اور پانی محل کا شنیزرا دہ سلیمان خطیب گدستہ ہوئے محمد میان کے پاس پہنچے تو وہ دوڑے دوڑے آئے اور پاک سے نکلے۔ چائے کا دوڑ چلا۔ اور پھر اصلی مو صنو ع پر آئے۔ محمد میان نے حب عادت جلسہ کے انعقاد ہی کی نہیں صفائی کا بارگاں بھی اپنے مصبوط کندھوں پر لیا۔ اب ڈر کس بات کا تھا؟ محمد میان اپنی گھنی مو نجھوں پر تاد دے کر جب اپنی رضا مند کا قاہر کر دیتے ہیں تو سمجھیئے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اطمینان کے ساتھ میں اور سلیمان خطیب تو شکر یہ سب جمود کی مسہ پہر کی رواداد ہے۔ شام ہوئی تو دعوت نامہ چھپوانے اور جگہ کا تھنک کرنے کے لئے میں اور محمد میان نیشنل جو نیز کالج کے چہار جلسہ منعقد کرنا تھا۔ نیشنل جو نیز کالج میں افضل صاحب اور ان کے دوست بیٹھیے دفتری کام میں مصروف تھے۔ پھر شرکت صاحب بھی آگئے اور سب سے ایم سیلہ حل ہو گیا یعنی دعوت نامہ چھپ گیا۔ ہال کو

حسب ہے حضورت ٹھیک کرنے کی ذمہ داری افضل کو سونپی گئی۔ اور ہم مطمئن رات کے کوئی سارے ہے نوبخہ اسٹیشن لوٹے آئے۔ مگر راستہ بھر سوچتے رہے۔ صدارت کس کی ہوگی؟ قرعہ فال منیر پاشا آہی کے نام پڑا۔ لگھر پہنچے۔ اتفاق میں وہ میرے کوارٹر کے سامنے "بیت المیر" میں اپنے کراچیہ دار سے ملنے آئے تھے۔ پکڑ لیے گئے۔ میرے ڈرائینگ روم کی بروشینیاں خلاف محتمول رات کے گیارہ بجے تک جلتی رہیں۔ لیکن اب بھی مسئلہ وہی تھا۔ جوں توں۔ صدارت کس کی ہوگی۔ اس خود وقت کے بیان یعنی خطیب کے سر تاج صدارت کس کر منیر پاشا پر چکر صاف نکل گئے۔

دوسرا دن صحیح کیا ہلی کرن کے ساتھ محمد میان ہیرے گھر آئے تو اس وقت جنپی اسرار
بدروم میں سورہی تھیں۔ سمجھو اپنے کاموں میں مفراد تھیں اور ملازم مرد کجھ میں ناشتمہ تھیں اسکے
حقیقی - چھپوڑی ہوتی جگہ پر سلیمان خطیب کا نام لکھ رکھ کر خانہ پوری کی چارہی تھی اور محمد میان
نصف وغوت نامے لے کر چلے گئے۔

بذریم کا در دازہ کھنکھٹا یا گیا۔ خادتاً ہمانوں نے پانی نہایا۔ اس دورانِ اکمل
میرے ساختہ تباہ۔ پھر شیرا پا آگئی۔ وہ چاہتی تھیں کہ حُسْنی سرور کو دُنیس کا لمح بھی
جا سکیں۔ ناشتہ پر اصرار کیا۔ وہ مغدرتِ خواہ تھیں۔ داصل وہ صحیح کا لمح جا رہی تھیں
اور جانے سے پہلے کہنے آئی تھیں کہ سارا طبع گیارہ بنے ہمیں کا لمح چلنا ہے لیکن کا لمح جانے سے پہلے
حُسْنی سرور اور خلیل صاحب درگاہ حضرت بندہ نواز پر حاضری دینا اصراری سمجھتے تھے چنانچہ
اس کا رخیر کے لئے بشیرا یا کوہی رہنا بنا دیا گیا۔

کام سے میری دلپسی کے بعد سلیمان خلیل اپنے کم سے پہلے گئے اور ہم لوگ دمین کا

پہنچے بسزگر دست دیا پر نیسل کانج سے نیاز حاصل ہوا۔ اور پھر کاروں اور پری منزل کے زینے طئے کرنے کے بعد منزل مقصود پہنچ گیا۔ کم رقت یہ خاصی اچھی تعداد سامیعن کی ہاں میں موجود تھی۔ کوہا مجزہ تھا جو شیر آپا سے سرزد ہوا تھا۔ مخفی شعر کا آغاز ہوا۔

حُسْنی سرور اس مخفی کی تہنا شاعر تھیں لیکن وہ غزلیں سناتے سناتے جب اس منزل سے خون ہوا ہے جب دل کا، تب جا کر پلکیں بھیگی ہیں
چکل چھکل ان آنکھوں کو کہتے ہیں پیجا نے لوگ

پر پہنچ گئیں تو ایسا لگا سارا ہاں کوہا یا ہمنوا ہو گیا ہے لڑکیاں کوہرس میں غزل گاری تھیں۔ اصرار اور انکار کی کشمکش جاری تھی اور پھر ایک ایسا لمحہ بھی آیا یہ بھننا مشکل تھا کہ شورہ تھا جو حُسْنی سرور کے معہ سے نکل رہا تھا یا پھر وہ جو مجھے اطراف و اکناف سراپا شعر بنے بلیجھے تھے بھوئی سارے ہے بارہ بجے کے قریب ہم "شحرور" کی مخفی سے اٹھ کر اپنے مکان کی طرف چل پڑے۔

جیسے جیسے رات بڑھتی جا رہی تھی۔ غالباً کہہ کی ففار اور بھی سوا ہوتی جاتی تھی جس مخفی مل ملیمان خلیب ہوں اس کا ایسا کہتا، حُسْنی سرور کی موجودگی نے تو فدا کو اور بھی پُروقار بنادیا تھا۔ "حکمل" کے صدر را چپا صاحب بھی تھے، میسر پاشا بھی، شریف تھے ڈاکٹر ملتا صریحی۔ محمد علی تھے صاحب جنی بھی لیکن اس موقع پر محمود بھائی کی بھی بُری طرح کھٹکے ہی تھی۔ وہ اپنی عزیز کی شادی میں حیدر آباد شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے اور وہاں صبح و شام بریانی پر ہاتھ صاف کر رہے تھے اور ادھر ہم انھیں یاد کر کے انگلیاں چھخار ہے تھے پہلے طعام پھر کلام کے اصول کے مطابق پہلے طعام پھر کلام کی پاری آئی۔

اور پھر یون ہوا حُسْنی سرور کے دھیانے سروں نے ماحول کو یادگار بنادیا۔ سلیمان خطیب نے اپنی پیرانی نظم "انتظار" نہیں سنائی بلکہ شراب کہن پڑائی۔ سب صحور و سرور تھے۔ وقت کا احساس نہ رہا۔ اسی نے کھا رات کافی ہو گئی ہے، مغل بخواست ہو گئی۔ غائب کردہ میں سنایا تھا۔ پھول پتیاں بھی خاوش اس سرود کے درختوں کے درمیان سے ہم سب سر جھکاتے باہر نکل رہے تھے۔ البتہ سلیمان خطیب کے جذبات فی البدیہ شعروں کی صورت میں دھن ڈھن کر زبان میں یوں ادا ہو رہے تھے جیسے کوئی رات کی تہناں میں نغمہ کارس گھول رہا ہو۔

جیسے جھیگے یہ لمحے سبک سازِ نظام
گھٹا جھوم کے میکدہ کھول رہی ہے
کس کی آشخوار کی رنگت کھابی ہوئی
میرے ساخز میں جیسے شقون گھول رہی ہے
خواب زارِ سخن کی لہکتی قندہ ۱۔
حُسْنی سرور کی جیسے عزل بول رہی ہے
بات کیا ہے خطیب و مکن کی نظر
آج اور کو معنی سب ہی قول رہی ہے ۲۔

ناشہہ کا انتظام بشیر آپا نے اپنے گھر پر کیا تھا۔ ڈائینگ ٹیبل پر ہم لوگوں

صلہ "خواب زار" (مجموعہ السلام) از حُسْنی سرور
صلہ "اور کو معنی" (تفقید) از طبیب الفهاری

کے علاوہ سلیمان تحقیقی اور مختصم علی بھی موجود تھے۔ ہاشمہ کے ساتھ ہی سماں نے تو جھونک کا سلسلہ بھی چاری تھا۔ چھٹکائے سناوے چار ہے تھے۔ چاٹے کے بعد محمد میان کا استھان رشروع ہوا۔ راچیا صاحب کی کار لے کر محمد میان آئنے والے تھے۔ وس نجع دہ کار لے کر آ تو کچھ دمکھاں پڑے کہ ہم سوار ہوتے معلوم ہوا کہ کار میں کچھ خراب پیدا ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ کار کے بینر تو ہم لوگ بھی بے کار رہتے اور میری اپنی بیانات کے باوجود ہم لوگ جلد گاہ پر بن گئے تا خیر سے پہنچے۔ روانہت کے مطابق جلسہ تاخیر سے شروع ہوا اور اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے سانچین بھی دیر میں آئے رہے۔ فائزبادی از دو غزل کی تذکر دامان کی مشکایت کر رہا تھا۔ اور جیتنے لوگ ہال میں تھے اس سے بھیں زیادہ ہال کے باہر کھڑے تھے۔ مزید تاخیر روانہ رکھتے ہوئے محمد میان جواب محمد بن علی کنوئیں کی حیثیت اختیار کر کچکے تھے۔ شریف احمد قریشی پرنسپل نیشنل جو نیز کام کا نام پیکار کر دے فہماں کا خیسرو قدم کریں۔ مشریف صاحب اپنی تحقیر سی شرعی ڈارھی سے بھی نہیں بکھر آہستہ اور نرم ہبھہ میں خیر مقدمی تقریر پر شروع کر کے شرافت کا مریدہ ثبوت فرائم کر رہے تھے۔ دیسے بھی آدمی ہیں اس کا اسم پا سکی۔ آنکھوں سے ذہانت اور چہرے سے شرافت پسکتی ہے اور برسہا برس سے پلک رہ کہے میں آئی تک اس میں کی پیدا نہیں ہوئی ورنہ ان دلوں خدائی قلت کے کچھ اتنے چھپے ہیں کہ لوگ نیشنل نیشن کے طور پر ہی سہی صنوعی قلت پیدا کر رہے ہیں میکن یہاں کیرفیت ہی دوسرا ہے۔ جبکن شرافت نے خسر پر کرتے جاتے ہیں اتنی ہی شرافت کا ان کی ذات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں شہر کے ادنی ماہی کے ہار سے میں جن اچھے خیالات کا اظہار کیا انہیں میں ان کی اسی ذاتی شرافت پر مہمل کرتا ہوں۔

شریف صاحب ابھی اپنے شرخاہ نرینہست پرستہ اس

نے میر انام پکارا۔ میسا کام تعارف کرنا تھا۔ لیکن میں نے آدھی ذمہ داری خود شاعرہ پرڈال دی اور دورانی تقریر پر اپنا کلام منہنک خواہش کی حسینی سرو غزل سراہوئیں اور خوب ہوئیں۔ سماع کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

کنو نیز نے سچویشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صدر "حکسلا" سے خواہش کی کم۔ وہ گلپوشی کریں۔ حسینی سردر کے علاوہ صدر جلسہ کی گلپوشی بھی کی گئی۔ گلپوشی کے بعد چہرائیک مرتبہ ہسینی سرور کی باری آئی۔ دو اور دو چار غزر لیں سنائی۔ سامعین تالیاں بجا بجا کر داد دے رہے تھے۔ جب جوان ہمہر مظہر مبارک ہائیک پر آئے اور نظمیں سنائی تو ہال داد سے گھونجنے اٹھا۔ اور سلیمان خطیب کی بارکات آئی اور انہوں نے اپنی عادست سے جبور مختل کروٹ لیا۔ مغل برخاست بھئی تو سچوں نے محسوس کیا وہ ہنس ہنس کر نیم جاں ہر چکے ہیں۔ حسینی سردر کو بار بار سُخنے کی آرزو میئے ہم سب باہر نکلے۔

وقت کافی ہو چکا تھا اور ابھی بارگاہ ہندہ نواز پر حاضری دینے کی آمد و تازہ بہ تازہ تھی اسی یہی محاضری دی گئی۔ روشنہ خرد بھی پہنچے جس کے بعد برو ہمہاں کے والد اور گلگرہ کے ممتاز ماہر تعلیم مولوی علی بن غالب کا مزار سے تشنگان علم دفن کا قافلہ مزار علی بن غالب پہنچا۔ فاتحہ خواری ہوئی اور قیوم سیکل چین نے دو ایک فوج ٹو لیئے اور پھر گھر روت آئے۔

اب جل چلاو تھا۔ یکافت ساری ہماہی جاتی رہی۔ ماحد کچھ بجا بجا ساموتا جا رہا تھا۔ بشیر اپا ہم گئیں۔ میز پاشا بھی پہنچے اور چھر آخڑ میں خندان کے بعد گریاں۔ سلیمان خطیب بھی ہم گئے۔ وہ آئے تو الیا محسوس ہوا وہ ہنساتے ہناتے اپنی نظم کے اثر دھھیر پہنچ گئے ہیں۔

پانچ بج پکے تھے آٹورک شاہ گیا۔
بس اسٹانڈ پہنچا دینے کئے
بس آئی۔

اور بے بسی کے عالم میں بس میں سوار کرایا گیا۔
اور بس چلی گئی

میرے لیوں پر حُسنی سرور کا یہ شعر تھا۔

ان کا آنا بھی کیسا آنا ہے
جیسے باد صبا کا جھونکا ہو

گھر بہنچا تو معلوم ہوا ذریںگ ڈبل پر حُسنی سرور عطر کی شیشی جھوڑ گئی میں
سارا بدروم معطر ہے

بڑے بھائی

ستاروں سے آگے.....

بڑے بھائی جب جواں تھے اکثر میں نے اپنے بچپن میں اقبال کا درج ذیل
شعر لکھنا تے انہیں سننا ہے میں
ستاروں سے آگے چانا اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں
عمر ابھی ساٹھ برس کے لگ بھگ ہو گی ۶۵، ۲۶ دسمبر ۱۹۸۶ء
اسری داخانہ (حیدر آباد) میں عشق کے امتحان سے گذر کر ستاروں سے آگے ایک نئے چہاں
کی تلاش میں نکل گئے۔

وَ إِنَّا لِلَّهِ وَ رَبِّ الْعَالَمِينَ
مُتَّقِيٰ إِلَيْهِ مَسْأَلَةٌ فَرَوْزَانٌ ہو ترا

نام محمد معین الدین الفشاری دالد کاتام مولوی محمد مختار شاخ الفشاری توفیق النذی۔

الذی شرف کے مشائخ نگرانہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم النذی کے مدرسہ سلطانیہ سرکاری عالی
ہی حاصل کی۔ قرآن، شرافی کی تعلیم بھی ۱۰ سال کی عمر میں حاصل کی اور تھی کیم عمری میں قرآن ختنی

کلے بارگاہ حضرت شیخ مخدوم علام الدین الفاری المعروف بہ حضرت لاڈلے مشارع الفاری
قدس سرہ اعزیز میں حاضری دیتے۔ دادا پیر[ؒ] سے والہانہ محبت تھی۔ اولادِ رسول[ؐ]
ہوئے کے ناطقے آں رسول[ؐ] سے بے پناہ محبت دل میں تھی۔ آخری دنوں میں محبت کے اعتبار
لے سردی سے بچنا ضروری تھا مگر سردوں کے زمانہ میں بھی وضو بنائے جماعت خازارا
کرنے کے لئے مسجد جایا کرتے تھے۔ بلکہ میرے لگر ایک مرتبہ مقیم تھے فجر کی نماز گھر ہی
پر ادا کرتے تھے دیکھ کر کہنے لگتے۔ ”مسجد جا بآ کرد۔“ ایک ایک کر کے ان کی باتیں
لیفجت آمیز باتیں مجھے یاد آتی ہیں۔ یہی کوئی سات، آٹھ برس کی عمر ہو گی۔ والد صاحب
ملازمت کے لئے چیتا پور میں تھے۔ ہم تینوں بھائی اپنی والدہ کے ساتھ محلہ انصاریاں انڈھر لیف
(ضلع گلبرگہ) میں اپنے بائی مکان میں مقیم تھے۔ بڑے بھائی آٹھویں جماعت ہی سے تعلیم کے
لئے حیدر آباد گئے ہوئے تھے سب کالج سے مہیرک پاس کیا، ایف اے (انسلیمیڈیٹ) ہوئے
اور جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے اور پھر ایلی ایلی بی کیا۔ دوران تعلیم ہی اپنوں نے پہلے سردوں میں
کیش میں ملازمت اختیار کی تھی تو ۱۹۴۸ء میں والد صاحب کو وظیفہ لینے اور المذکور شریف
میں قیام کرنے پر مجبور کیا۔ والد صاحب اپنے بھائی بہت اعزیز رکھتے تھے اور یہ والد صاحب
پر سجان چھڑ کتے تھے۔ والد صاحب الفرستقل ہوئے اور میں اور پیرے دلوں بھائی
کلیم الدین الفاری اور رشید الدین انصاری اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ حیدر آباد منتقل
ہو گئے۔ بڑے بھائی نے بیگم بازار میں کراچی پر گھر لے لکھا تھا اسی محلہ میں چند برسوں تک
رہے۔ ہی برس القلب کی آواز کا نؤں نے پہلی مرتبہ سنی تھی۔ جمود کا دن تھا۔ بیگم بازار
بیدروارڈی کی مسجد میں بعد نماز ہر سے پنج و پیکار کی آوازیں سیئیں۔ کلیم بھائی بازار کھڑے
تھے۔ پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے۔“

”یہ پاشا کی حکومت ختم ہو گئی!“ انہوں نے تختہ سما جواب دیا اور میں

کب تفصیل سنتے کا اہل تھا؟ پچپ رہا اور پچپ چاپ ایک عہد گزد گزد گیا۔

بڑے بھائی کو مطابعہ کا بے حد شوق تھا و الد صاحب مرحوم ہی کی طرح انہیں بھی تاریخ اسلام سے خصوصی دلچسپی تھی۔ غالباً ایسے میں انہوں نے تاریخ اسلام مصنون اخذتیاری لے رکھا تھا۔ اخبارِ عینی کا شوق تھا۔ خود بھی آصفیہ کتب خانہ (اسٹریٹ سنٹرل لا ہبیریری) پابندی سے جاتے اور ہم بھائیوں کو بھی کتب خانہ جانے اور مطالعہ کرنے کی سختی سے ہدایت کرتے تھے میں مدرسہ تحائف بیگ بazar میں پڑھتا تھا اسی زمانہ میں "بچوں کی لیگ" اخبار روزنامہ رہنمائی دکن کامبر بناتھا میرے نام سے بیسیے اور کہانیاں چھپنے لگیں۔ تو جی خوش ہوتا تھا۔ پہنچی میں نام چھپا دیجئے کہ کون خوش نہیں ہوتا ہے خوشی کا سلسلہ دراز ہے اور آج بھی میں اپنا نام اخباروں اور کتابوں میں چھپا دیجئے کر سخونش ہوتا ہوں۔ پڑھنے لکھنے کا جو شوق مجھے آج بھی ہے یہ سب میرے بڑے بھائی کی تربیت و تعلیم کا نتیجہ ہی تو ہے! وہ اکثر کہتے اور خصوصاً امن وقت جب میں تساہل بر تھا صدر کہتے۔ "کیا پات ہے تمہاری کہانی اخبار میں نہیں چھپی؟" میرے دوست بھی پوچھ رہے تھے! "لکھنے کا ایک نیا جوش اپنے میں پاتا۔ پتہ نہیں وہ میری قلم و ترقی سے کتنے خوش تھے؟ تاہم انہیں اس بات کا اطمینان فرید تھا کہ جس پوادا کی انہوں نے آبیاری کی تھی اب وہ بیگ و بار لار ہا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو پیڑ لگانا اور اسے پانی دینا تو جانتے تھے لیکن اس پیڑ کے پھول پھولوں سے استفادہ کی تھا انہیں رکھتے تھے۔ خود دار ایسے کہ در خدا بند ہو تو داپس چلے آئیں۔ درستک دینے اور درست سوال دراز کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بڑے بھائی نے سمجھ دکھ اور سکھ کے ایام دیکھے ہیں مگر وکھ کے ایام میں اپنی حاجت اور بحیثی کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس نگنے کے لئے نہیں دینے کے لئے پیدا ہوئے تھے ماں گنا

ان کی فطرت نہ تھی دینا ان کی عادت تھی! بڑے بھائی کی خودداری کا یہ عالم کہ سمجھا
ہیں زبان پر کلمہ طبیبہ ہے اللہ، اللہ کا ذکر جاری ہے مگر درازی عمر کے لئے
نکاح کے دو بولی نہیں! اللہ نے اہمیں یاد کیا اور وہ چُپ چاپ پچھلے گئے۔ مرنے سے
پہلے انہوں نے وصیت کی تھی کہ۔ اہمیں ہمارے خاندانی ہڑواڑ درگاہ النبی و الدصلی
کی قبر کے بازو دفن کیا جائے سو وہ پوری ہوئی۔ بڑے بھائی اقبال کے شیدائی تھے۔
ان کی زیارت کے بعد جب میں اللہ سے گلپرگہ لوٹا ہوں تو میرے خالو خسر مولوی
سید احمد کبیر صاحب کا کینڈا سے خط ملا۔ انہوں نے اپنے ماں کے استقال کی خبر
دیتے ہوئے اقبال کے چند شعر نقل کئے ہیں۔ میرے لیے برسو قع ثابت ہو گئے۔ میں

آپ کی نذر کرتا ہوں سے

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آسال ہے موت
گلشن ہستی میں مانندِ نیم ارزال ہے موت
زلزلے ہیں بجیاں ہیں تحطیق ہیں آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں
کلیہ افلاس میں دولت کے؛ کل کھشانے میں موت
دشت و در میں شہر میں، گلشن میں ویرانے میں موت
نے جمالِ مشکوہ ہے، نے طاقتِ گفتار ہے
زندگی کیا ہے، اک طوق گلو افشار ہے

اقبال ترجمانِ حقیقت تھے، حقیقت بیان کی ہے بڑے بھائی اقبال کے
شیدائی، وہ دنیا کا قانون تو پڑھ کرکے تھے مگر اس سے زیادہ قانون فطرت سے ساگاہی
رکھتے تھے اس نے موت جیسی تکونِ حقیقت کا سامنا بھی کیا۔ بڑے بھائی، زندگی کی

حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیشہ فکر مندر ہا کرتے تھے جب وہ استقال کر چکے تو میں نے اسی
تفکر کی مکریں ان کے چہرے پر دکھی یہی گویا مرنس کے بعد بھی انہیں ستاروں سے آگے
کے جہاںوں کی تلاش مقصود ہے اور گویا وہ کہہ رہے ہوں ہے

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردہ میں بیداری کا اکی خیام ہے

مصنف کی دیگر تصانیف

۱۔	حسرہ و تنقید	۶۱۹۷۹	۳۵۰ روپے
۲۔	ادرائی معنی	۶۱۹۸۲	" ۴۱..
۳۔	میرا شہر، میں کروں	۶۱۹۸۳	" ۵۱..
۴۔	یارانِ شہر	۶۱۹۸۶	" ۱۰۵..
۵۔	تطبیق دکن (مشترکہ تالیف)	۶۱۹۸۹	" ۷۱..
۶۔	حیدر آباد میں اردو صحافت	۶۱۹۸۰	" ۳۲۰..
۷۔	چکبرگ سے گلبرگ تک	۶۱۹۸۲	۱۰۵.. ۰
۸۔	سوانح عمری حضرت علام الدین انصاری (مشترکہ تالیف) طبع اول	۶۱۹۸۳	" ۲۱..

۹۔	نضرتی کی شاعری	۱۹۸۸ء	۱۰۰ روپیہ
۱۰۔	خانقاہی نظام	۱۹۸۶ء	۱۰۰ روپیہ
۱۱۔	سوائج عمری حضرت ملا الدین انصاری (مشترکہ تالیف)	۱۹۸۶ء	۲۵ روپیہ
۱۲۔ سید حیدر آباد رے	۱۹۸۸ء	۲۰ روپیہ

و

لہٰ آباد حسینیہ دارالعلوم ابادی حسینیہ دارالعلوم

(جعفر مرضائیں)



ڈاکٹر طیب النصاری

